Volume:11 Issue: 12 December 2018

مُدیر

مولانا محمد عبد القوی

www.idara.info

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

اشرف الجرائد کی توسیع و اشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

کفر کی جمعیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسوہ

مولانا عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ　بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ﴿۱۷۳﴾ (سورۃ ال عمران)

ترجمہ: وہ لوگ جن سے کہنے والوں نے کہا تھا کہ یہ (مکہ کے کافر) لوگ تمہارے مقابلے کے لئے (پھر سے) جمع ہو گئے ہیں لہذا ان سے ڈرتے رہنا تو اس خبر نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بول اٹھے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

تشریح: واقعہ ہے حمراء الاسد کا، جب مسلمان احد میں عارضی شکست سے دو چار ہوئے، ستر صحابہ کرامؓ شہید اور متعدد صحابہؓ زخمی ہوئے، دنیائے کفر و شرک میں ایک تہلکہ مچ گیا، مکہ واپس ہوتے ہوئے یہ خیال کرنے لگے کہ جب فتح ہماری مقدر ہو گئی تھی، معاملہ ہمارے قابو میں آ گیا تھا تو ہم کو اس مہم کے آخری نقطے تک پہنچ کر تمام ہی مسلمانوں کا صفایا کر دینا چاہیے تھا تا کہ یہ مہم اسلام کے خلاف آخری مہم ہو جائے؛ مگر سر کوبی کے لئے پلٹنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ قدرت نے ان کے قلوب میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ مرعوب ہو کر اپنی راہ لینے پر مجبور ہو گئے لیکن انا اور کبر کے قدم مرعوبیت کے ساتھ واپس لوٹنے پر کیسے راضی ہوتے؟ اپنی انا کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مدینہ کی جانب جانے والے مسافروں سے کہا: اگر تم کو راستے میں مسلمان مل جائیں تو ان سے کہنا کہ مکہ والے پوری جمعیت کو لے کر مزید تیاری کے ساتھ تم پر حملہ بولنے والے ہیں۔

ادھر غزوۂ احد کے دوسرے دن نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مجاہدین میں منادی کروائی کہ ہمیں مشرکین کا تعاقب کرنا ہے مگر اس میں وہی لوگ جا سکیں گے جو کل کے معرکے میں شریک رہے، اس اعلان کے بعد چشم فلک نے جاں نثاری و فداکاری کا ایسا منظر دیکھا کہ زخم خوردہ، بیساکھیوں پر چلنے والے، ٹوٹی تلوار، لہولہان جسم مگر ہمت و استقامت سے سرشار صحابہ کرامؓ نے صدائے محبوب پر لبیک کہا پھر مشرکین کے تعاقب میں مقام

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

حمراء الاسد تک پہنچے، نعیم بن مسعود ملے، اور بتایا کہ ابوسفیان اپنے ساتھ لشکر جمع کر کے مدینہ پر چڑھائی اور اہلِ مدینہ کے استیصال کا ارادہ کر چکا ہے، اس خبر وحشت اثر کو سن کر صحابہ کرامؓ کی زبان سے بیک جنبش یہ توکل واعتماد کے الفاظ نکلے، حسبنا اللہ و نعم الو کیل اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہی بہترین مددگار ہے۔

قرآن مجید میں جس مقام پر غزوۂ اُحد کا واقعہ تفصیل سے آیا اگر ان آیات کو غور سے پڑھیں تو ہمارے سامنے صحابہ کرامؓ کی تین اہم صفات کھل کر سامنے آتی ہیں جو دراصل ان کی کامیابی کی ضامن رہیں۔

پہلی صفت اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ یعنی جسمانی زخم خوردہ ہونے کے باوجود اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنا، اور چوں وچرا کا دل میں احساس تک پیدا نہ ہونا یہ وہ عظیم صفت ہے کہ جب کبھی یہ صفت مسلمانوں میں پیدا ہوئی تو کامیابیوں نے ان کی قدم بوسی کی، اور ہم مسلمانوں سے یہ وقت کی صدا ہے کہ ہم بھی اس صفت کے خواہی نہ خواہی طبعی ناگواری کے باوجود خوگر ہو جائیں تو حالات کا رُخ بدل سکتا ہے۔ دوسری صفت یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ جہاں عمل میں پختہ، جذبۂ جہاد سے سرشار، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جاں نثاری کے لئے بے قرار تھے وہیں ان کی ایک بہت بڑی خوبی احسان وتقویٰ سے آراستہ رہنا تھا اور یہ وہ خوبی ہے کہ جب ہم مسلمان اس سے متصف ہو جاتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ندا پر لبیک کہنا اور ہر حکم پر چلنا ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ تیسری صفت یہ تھی کہ ہر مصیبت وحادثے کے وقت ان کی زبان پر حسبنا اللہ و نعم الو کیل ہوتا یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل درجے کا توکل واعتماد۔

اس واقعے میں کفر کی جمعیت کی حقیقت، ان کی بزدلانہ واپسی، صحابہ کرامؓ کی شجاعت و بہادری اور ان میں شجاعت و بہادری کے پیدا ہونے کے اسباب وعلل، پھر پیش آمدہ افواہوں وحادثوں کے باوجود ان کا اللہ کی ذات پر بے انتہا توکل واعتماد، حالات ومسائل پر ازدیادِ ایمان کی صفت خاص وغیرہ پر مشتمل عبرت پذیری اور نصیحت آموزی کے ان گنت سبق ہیں۔

آج کے نازک حالات میں ــــ جب کہ کفر کی ہانڈی میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جوش واُبال دکھائی دے رہا ہے اور ان کا ناپاک اجتماع مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کی نت نئی سازشیں کر رہا ہے ــــ ہم مسلمانوں کے لئے اس واقعے میں ہر زاویے سے رہنمایانہ خطوط موجود ہیں اگر ان پر عمل کر لیا جائے تو جیسے قرنِ اول میں کفر کا بھرم ٹوٹا تھا، آج بھی ٹوٹ سکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز اور اسلام کے ہر تقاضے پر لبیک کہنے، ذاتی مصالح کے بجائے اسلامی مصلحت کو مقدم رکھنے، احسان وتقویٰ سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے، مصائب اور آلام کے وقت اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی ذات پر توکل کرنے کی توفیق سے مالا مال فرمائے۔ آمین

دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے

مولانا مفتی عبدالعزیز اللجی قاسمی*

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ

(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے لئے سب سے بڑے ناصح اور حکیم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر ارشاد اپنے اندر معانی و مطالب کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات علماء کرام نے ارشادات نبوی کے کئی کئی مطالب و معانی بتلائے ہیں، بلکہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادات کو جوامع الکلم سے تعبیر فرمایا کہ الفاظ تو مختصر مگر معانی حکمت و مطلب کا ٹھاٹے مارتا ہوا سمندر رہیں۔

اس حدیث ہی میں غور کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کی دو حیثیتیں بیان فرمائیں ہے۔ یعنی ایک ہی دنیا مومن آدمی کے حق میں الگ درجہ کی چیز ہے تو وہی دنیا کافر کے حق میں بالکل اس کے مخالف درجہ کی چیز ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو مومن کے لئے قید خانہ قرار دیا ہے۔ قید خانہ کی زندگی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک قیدی زندگی گزارنے میں آزاد نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز میں وہ جیلر کے احکام کا پابند ہوتا ہے، نہ وہ اپنی مرضی سے کھا سکتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے پی سکتا ہے، نہ ہی اپنی مرضی کا لباس پہن سکتا ہے، حد تو یہ ہے کہ جو انسان آزاد پیدا ہوا ہے اب وہی لاچار قیدی اپنی مرضی سے کھلی فضا میں رہ بھی نہیں سکتا بلکہ جہاں بیٹھنے کا حکم دیا گیا بیٹھ گیا جہاں کھڑے ہونے کو کہا گیا کھڑا ہو گیا۔

غرض یہ کہ قید خانہ میں اپنی مرضی بالکل نہیں چلتی بلکہ چار و ناچار ہر معاملہ میں دوسروں کے حکم کی پابندی

---

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

کرنی پڑتی ہے، اسی طرح جیل اور قید خانہ کی ایک دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی بھی قیدی اس قید خانہ میں دل نہیں لگا تا اسے اپنا گھر کبھی نہیں سمجھتا بلکہ ہر وقت اس سے نکلنے کی تمنا اور کوشش کرتا ہے۔ تیسری خاص بات یہ بھی ہے کہ قید خانے میں قیدی رنج والم میں رہتا ہے، مصیبتیں اور تکالیف جھیلتا ہے، اُسے یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قید خانے میں راحت وآرام کا خیال بھی عبث ہے۔ اس کے مقابلہ میں جنت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں جنتیوں کے لئے کوئی قانونی پابندی نہیں رہے گی ہر جنتی اپنی مرضی کی زندگی گزارے گا اور اس کی ہر خواہش اور ہر آرزو پوری ہوگی اس طرح لاکھوں برس گذرنے کے بعد بھی کسی جنتی کا دل جنت سے اور جنت کی نعمتوں سے نہیں اکتائے گا اور نہ کسی کے دل میں جنت سے نکلنے کی خواہش پیدا ہوگی۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ''وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ'' (الزخرف) جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کو تمہارے دل چاہیں اور جس کے نظارے سے تمہارے آنکھوں کو لذت وسرور حاصل ہو اور تم اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔ سورہ کہف میں ہے ''لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا'' جنتی جنت سے کہیں اور منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

لہٰذا اس حدیث میں ایمان والوں کو خاص طور پر یہ سبق دیا گیا کہ وہ دنیا میں حکم اور قانون شریعت کی پابندی کے ساتھ قید خانہ والی زندگی گذاریں اور دنیا سے جی نہ لگائیں، دنیا میں راحت طلبی اور دائمی سکون و انبساط کا خیالِ خام بھی نہ لائے۔ اور اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ اس دنیا کو اپنی جنت سمجھنا اور اس سے اپنا دل لگانا اور دنیوی زندگی کو اپنا اصل مقصود بنانا کافرانہ طریقہ ہے۔

حضرت شاہ حکیم اختر صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کافر اگر بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا ہے تب بھی یہ دنیا اس کی دوزخ کے مصائب کے مقابلے میں جنت ہے اور اگر عیش میں ہے یعنی شہواتِ نفسانیہ کی تمام لذتوں کو اُڑا رہا ہے تب بھی دوزخ کی تکالیف کے مقابلے میں موت سے قبل یہ دنیا اس کی جنت ہے۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں دنیا کی حقیقت ص: ۱۲)

الغرض یہ حدیث ایک آئینہ ہے جس میں ہر مومن اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ اگر اس کے دل کا تعلق اس دنیا کے ساتھ وہ ہے جو قید خانہ کے ساتھ قیدی کا ہوتا ہے تو وہ پورا مومن ہے اور اس کا حال دنیا سے ایسا ہے کہ دنیا ہی کو اپنا مطلوب ومقصود بنالیا ہے تو یہ حدیث بتاتی ہے کہ اس کا حال کافرانہ ہے، اگر مومن حالِ بد سے دوچار ہے تو بہتر حال بنانے کی فکر کرے اور اگر خوش حال ہے تو شکرِ رب کرتا رہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی حقیقت ہماری نگاہوں میں کھول دے، اس کے دھوکہ سے بچائے۔ آمین

پیش گفتار

مساجد کے ذمہ داروں اور مُصلِّیوں سے ایک گذارش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـ وبہٖ نستعین

ہماری ریاست میں حکومت کی طرف سے ائمہ ومؤذنین کونذرانہ پیش کرنے کی بات آتی رہتی ہے، جب بھی اس کا اعلان ہوتا ہے مسجد کمیٹیاں بھی خوش ہوتی ہیں اور ائمہ ومؤذنین بھی درخواستیں لے کر تیار ہوجاتے ہیں، جب کہ اکابر علماء ماضی وحال کے احوال کی روشنی میں متعدد اہم وجوہ سے اس کو منبر ومحراب کی آزادی واحترام کے لئے سمِ قاتل اور سماجی، دینی اور اخلاقی مصالح کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہوئے اس سے منع کرتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ اکابر علماء مزہ میں ہیں ان کو ہم اصاغر کی تکالیف کا احساس نہیں ہے، نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ایک بڑی تعداد اس خطرہ میں بہ خوشی مبتلا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خدامِ دین بالخصوص ائمہ ومؤذنین کی معاشی صورتِ حال واقعی قابلِ فکر ہے مگر اس میں حکومتوں کا دل چسپی لینا فریبِ محض ہے، آزادی کے بعد سے اب تک ملک کے غیور مسلمانوں نے اُسے اپنا کام سمجھا ہے جس کی برکت سے خدمتِ دین کی شبیہ باوقار وتابناک رہ سکی ہے، اگر خود مصلیان ومتولیانِ مسجد تھوڑی توجہ دے کر اور عوامی امداد ہی کو بڑھا کر مشاہرات کو معقول بنا دیں تو حکومتوں کے احسان کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور ائمہ مؤذنین کی شکایت بھی دور ہوجائے گی، ذیل کی تحریر اسی پسِ منظر میں لکھی گئی ہے۔ از: مدیر

اس گئے گذرے مادیت زدہ اور خدا بیزار دور میں ــــ جبکہ ساری دنیا عیش وعشرت، مال ودولت اور ثروت وشہرت کو مقصودِ حیات بنائے ہوئے ہے ــــ علماء وحفاظ کی ایک بڑی تعداد پوری ذمہ داری ویکسوئی سے دینی خدمات سے وابستہ ہے، اور مسلمانوں کی دینی قیادت اور اُن کے عقیدہ وایمان کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہی ہے، مُعمَّر وسن رسیدہ حضرات تو اس کام میں لگے ہوئے ہیں ہی نوجوان اور کم عمر علماء بھی دینی خدمت کے میدانوں میں سرگرم عمل ہیں؛ غور کیا جائے کہ عمر کے اس حصے میں فطری طور پر آدمی میں خواہشات وجذبات کا غلبہ رہتا ہے اس کے باوجود علماء کرام کا اپنے فطری جذبات واحساسات پہلو میں دبا کر اور ہر تمنا پہ قابو پا کر معمولی

وظیفوں اور نا قابل ذکر تنخواہوں پر دینی خدمات ــــ تعلیم و تدریس، امامت و خطابت، اذان و نماز، وعظ و تبلیغ اور مذہبی فتنوں، آزمائشوں، گمراہیوں سے ملت کا تحفظ وغیرہ ــــ میں جوش و خروش اور فکر و لگن کے ساتھ مشغول رہنا، تنگیوں ترشیوں کے احساس کے باوجود ان کی پرواہ نہ کرنا، تکلیفوں اور مشقتوں کے سامنے کے باوجود فرائض کی ادائیگی کرتے رہنا، گھر والوں کی ناراضگی و شکایات، معصوم بچوں کی خواہشات اور مطالبات سے شکستہ دل اور مجروح قلب ہونے کے باوجود ہر فتنے کے مقابل کھڑے ہوجانا اور ہر خدمتِ مذہب و ملت کے لئے مستعد رہنا، ــــ خدا دیکھنے والی آنکھ دے تو ــــ یہ اس جماعت کی حیرت انگیز کرامت اور نبی ﷺ کا عظیم معجزہ نظر آئے گا۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر یہ علماء وائمہ اور موذنین و معلمین دنیاوی چمک دمک اور دولت کی ہوس سے مستغنی ہوکر اپنے فرائض ادا نہ کرتے اور تنگی ترشی کی آزمائشوں کو اپنی بلند حوصلگی و عالی ہمتی سے سر نہ کر لیتے تو آج کے اس ماحول میں پورا ہندوستان ہم آغوشِ کفر و جہل ہوگیا ہوتا، دین داری کا بقاء تو کجا شعائر دین کا نام و نشان ڈھونڈنا بھی مشکل ہوجاتا؛ سلام ہو ان کی عزیمت و ہمت کو!

یہ تمہیدی سطور میں نے اُمت کے دانش مند و تعلیم یافتہ طبقے کو اُن کے ایک اہم فریضے اور مسئولیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے تحریر کی ہیں؛ اور وہ یہ ہے کہ جو بے شعور اور غریب مسلمان ہیں وہ خود قابل رحم ہیں لیکن جو متمول سمجھ دار اور پڑھے لکھے مسلمان ہیں کیا وہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ جو لوگ اپنے نبی ﷺ کے مشن اور دین اسلام کی علمی و عملی تقاضوں کو شخصی تقاضوں پر ترجیح دے کر ملت کی مخلصانہ خدمت میں دن رات مصروف ہیں ان کی معاشی سرپرستی اور ضرورتوں کا تکفل ہمارا ہی دینی فریضہ اور اسلامی تقاضہ ہے، ہم اگر اس کی فکر نہ کریں گے تو کیا اس فریضے کو حکومت ادا کرے گی؟ ایک جمہوری ملک میں اقلیتی حیثیت سے رہنے والے مسلمانوں کے لئے سوائے اس کے اور کیا صورت ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے دینی معاملات وہ مسائل اور ملی ضروریات و وسائل کی خود فکر کریں اور اپنے خون پسینے کی کمائی میں سے ایک حصہ ان کاموں کے لیے اپنی سعادت سمجھ کر وقف کردیں۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کا اقتدار رہا خدمتِ دین کے معروف مناصب پر حکومتیں تقرر کرتی تھیں اور ان کو وظائف و مشاہدات بھی سرکاری خزانوں سے بہم پہنچائے جاتے تھے، لیکن مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد جب تمام دینی کاموں کا معاملہ مشکل میں پڑ گیا تو اس وقت کے رؤسا و نوابان نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت اپنے شخصی خزانوں سے خوب لُٹائی اور دادِ داد و دہش حاصل کی، لیکن ظالم انگریزوں نے مختلف بہانوں سے ان کی املاک اور جائیداد ضبط کرکے دین کے کاموں کے لیے مالی وسائل کا تقریباً خاتمہ کردیا؛ اس کے بعد سے آج تک ملت کے غیور افراد چندۂ عام اور مساعدات وقتیہ کے

ذریعے لاکھوں مساجد، ہزاروں مدارس، بے شمار انجمنوں اور جماعتی وانفرادی محنتوں کے مصارف پورے کررہے ہیں۔فجزاھم اللہ خیرا الجزاء

اس حقیقت کے اعتراف کے باوجودہمیں ملت کے دولت منداور باحیثیت طبقہ سے یہ شکوہ ہے کہ وہ خدامِ دین کی خدمتِ مالی میں غیرذمہ داری وبے پروائی کا ثبوت دے رہے ہیں، گرانی ومہنگائی کے اس دور میں ۳۰ تا ۴۰/ہزارروپے میں بھی ایک متوسط خاندان بمشکل گزارا کررہا ہے، خدامِ دین کی آمدنی مسجد، مدرسہ، ٹیوشن سب ملاکر ۱۲/ ۱۵ہزار سے زیادہ نہیں ہو پاتی ، بالخصوص اُن علماء کی جوعلمی مصروفیات سے وقت فارغ نہیں کرپاتے اس سے بھی کم یافت رہ گئی ہے؛ وہ اسی میں کسی طرح گزربسر کرنے پر مجبور ہیں، کوئی ناگہانی صورت حال پیش آتی ہے تواوزیادہ پریشان ہوجاتے ہیں، خدامِ دین کی اس صورتحال کاسب کو پتہ ہےلیکن کیاملت کاذی حیثیت طبقہ اس بارے میں کچھ غورکررہا ہے؟ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ علماء کواپنی ضروریات کے سلسلے میں خودمکتفی ہوناچاہیےمگراس خوداکتفاءاورشخصی ذرائع آمدنی کےوسائل واسباب کا کوئی منصوبہ آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔

ہاں! یہ کہاجاسکتا ہےاوربعض بےخبر ونادان لوگ کہتے بھی ہیں کہ مولویوں کوصنعت وحرفت سکھائے جانے چاہیے تاکہ وہ دن رات قوم وملت کی علمی ودعوتی خدمات کے ساتھ اپنی قوت بازو سے اپنی روزی کما لےسکیں، ہمارے خیال میں ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جونہ دینی وملی تقاضوں سے باخبر ہے نہ ہی حالاتِ زمانہ سے واقف! بس زبانی جمع خرچ اور ہوائی منصوبے داغنے کاعادی ہے، کوئی صاحبِ سمجھ ایسی بات نہیں کہہ سکتا؛ کیایہ ممکن ہے کہ ایک آدمی صبح سے شام تک اپنی روٹی روزی کے حاصل کرنے میں مشغول ہو، ملازمت کرتا ہو، تجارت کرتا ہو، فرنیچر تیار کرتا ہو، اے سی اورموٹرسائیکل بناتا ہو، الیکٹریشن کا کام کرتا ہو، مزدوری کرتا ہو، اور پانچ نمازیں پڑھانے کے لئے مسجد میں بھی موجودرہ سکتا ہو؟ پانچ وقت کی اذانیں دینے اور مسجد کی صفیں صحیح کرنے وضوخانے دھونے کے لئے پانچ گھنٹے مسجد کو دے سکتا ہو؟ یا دن بھر کی محنتوں سے تھک ہارکر بھی شام کو خطاب کرنے کے لئےجلسہ ٔاصلاح معاشرہ اورسیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچ سکتا ہو؟ قوم کے بچوں کی قرآنی و دینی تعلیم کے لئے مکتب بھی پڑھا سکتا ہو؟ فرق وفتن کے مقابلے کے لئے سفرکرکے گاؤں گاؤں کی خاک بھی چھان سکتا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ علمائے کرام وحفاظِ عظام اپنی روزی روٹی کے لئے درکاروسائل میں مشغول رہیں اورمدرسے بھی چلتے رہیں، کتابیں بھی لکھی جاتی رہیں، فتاویٰ بھی دیئے جاتے رہیں؟ بچے قرآن کریم کے حافظ اورعلوم دینیہ کے حامل بنتے رہیں، محراب خوش الحان تلاوتوں سے گونجتے رہیں اورمنبر رشدوہدایت کے پیغام دیتے رہیں؟ باطل کاقلع قمع ہوتارہے اورملت کے لئے اپنے دین وایمان اورعقیدہ وعمل کودنیا سے سلامت لے جانے کاسامان بھی ہوتارہے؟

تصوّر ہی میں سہی ایک مرتبہ ماضی میں جھانک کر یا مستقبل پر نظر ڈال کے دیکھ لیں کہ خدامِ دین اگر خدمتِ دین کے لئے ایثار واستغناء اور زہد وقناعت کے مبارک جذبوں کو چھوڑ کر ــــ ان عقل مندوں کے مشوروں کے مطابق ــــ ذخیرہ اندوزی ودولت طلبی اور خوش عیشی کی راہ پر چل پڑیں تو دنیا تو وہ اپنی یقیناً بنالیں گے اور خدامِ دین کو اپنا بوجھ سمجھنے والوں کا بوجھ یقیناً ہلکا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد مسجدوں کی ویرانی، بستیوں کی تباہی، معاشرے کی خرابی اور کتاب وسنت کی نابودی کا جو حال ہوگا اور سب سے بڑھ کر ملت کی نسلوں کے دین وایمان کا جو حشر ہوگا، وہ ہر عقل مند سمجھ سکتا ہے؟ مرحوم اقبال نے افغانستان کے دورے کے بعد ابلیسِ لعین کی زبان سے بالکل سچ کہلوایا تھا۔

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

یعنی خدامِ دین کو دنیا داری کی ہوس میں مبتلا کر کے دولت کی ریل پیل اور کسب وکمائی کی دوڑ میں لگا دینا، پوری قوم کی غیرت ایمانی اور حمیتِ اسلامی کو داؤ پر لگا دینے کے لیے بہت کافی ہے، اور ایک ملک کے اس تجزیئے اور مشرق ومغرب کے تجربے کے بعد ہی شاید متفکر و بے چین ہو کر انہوں نے اپنی مناجات میں مولائے کریم سے یہ التجا کی تھی۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

خیر! مولویوں اور دین کے خادموں کو قوم کا بوجھ اور سماج کے بے کار لوگ سمجھنے والوں اور انھیں اپنی روزی روٹی کی خود فکر کر لینے کی صلاح دینے والوں کی عقل وفہم اور دین ودانش کا ماتم کرنے کے بجائے ان کے مخلصانہ مشوروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن سے صرف وہ بات کہنا چاہتا ہوں جو شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمہ اللہ نے کسی ایسے ہی ناسمجھ مخلص کو بتلائی تھی جنہوں نے شیخ کو مشورہ دیا تھا کہ ان طلبۂ مدارس کو کوئی صنعت وحرفت بھی سکھانا چاہیے تا کہ وہ معاشی طور پر خود مکتفی ہوسکیں قوم کا بوجھ نہ بنیں، حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ہم کو علم اور دین سکھانا آتا ہے، ہم مدرسہ قائم کر کے ان بچوں کو علم دے رہے ہیں، دین سکھا رہے ہیں، یہ صنعت وحرفت کا کام بھی ہم ہی کیوں کریں؟ آپ کو یہ کام کرنا آتا ہے آپ ہمیں مشورہ دینے کے بجائے خود اس کام کو انجام دیں، آپ صرف ہم کو مشورے دیتے رہیں گے یا خود بھی کچھ کریں گے؟''

یہ الزامی جواب ہے۔ تحقیقی جواب یہ ہے کہ

ہم نے خود ہی جان بوجھ کر ان طلبۂ علم دین کو دنیوی ذرائع معاش سے لُولا لنگڑا رکھا

ہے، تاکہ ان کے لئے عالم دین بننے کے بعد سوائے خدمتِ دین کے اور کوئی میدانِ محنت نہ رہے، مجبور ہو کر ہی سہی اُس کام میں یکسوئی سے لگ جائیں جس کی ملت اسلامیہ کو ان کی جانوں سے زیادہ ضرورت ہے۔ (مفہوم ملفوظ)

کیا اس چشم کشا اور واضح جواب کے بعد بھی آپ ان خدامِ دین کو اپنا اور اپنی نسلوں کا محسن سمجھنے اور ان کی ہر طرح خدمت واعانت کو سعادت وخوش نصیبی ماننے کے بجائے انہیں اپنا بوجھ اور قوم کا ناکارہ طبقہ ہی سمجھتے رہیں گے؟

اس لئے قوم کے سنجیدہ سمجھدار اور دین پسند طبقے سے ـــ جو کہ ماشاءاللہ مسلم سماج کے ہر شعبے میں موجود ہے ـــ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کم از کم آپ تو دین کے خدمت گزاروں وراثتِ نبوی کے رکھوالوں اور امانتِ الٰہی کے پھیلانے والوں کو بہ نظر توقیر دیکھیں، اور آپ دیکھتے ہی ہیں مگر صرف احترام سے دیکھنے دعوتیں کر دینے اور دعائیں لے لینے پر اکتفانہ کریں بلکہ ان کی بہتر معیشت اور اطمینان بخش روزی کے سلسلے میں بھی غور کریں، عیش وعشرت کی بات نہیں ہے ضرورتوں کے بہ سہولت پورے ہونے کا مسئلہ ہے زمانے کے بدلتے حالات نے حوائج حیات اور ضروریات زندگی میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے اور ان کا پورا نہ ہونا خانگی زندگی میں دشوار گزار صورت حال پیدا کرتا ہے، یقیناً روزی کی کمی بیشی اور بسط وقدر قدرت کی عظیم حکمت کا مظہر ہے، لیکن تکمیل ضروریات کی فکر بہر حال ان اسباب کے قبیل سے ہے جن کا بندوں کو پابند فرمایا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایسا نہیں ہے کہ ہم آپ ہی کو متوجہ کر رہے ہیں اور غیرت دلا رہے ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ خدامِ دین کو صبر وثبات کی تلقین کر رہے ہیں اور سلف کے حالات ان کے عزائم حوصلے بتا بتا کر دین کی خدمت سے جڑے رہنے اور کسی بھی صورت میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور علمِ دین کے تحفظ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہ ہونے کی تعلیم وتاکید کر رہے ہیں اور یہ خدا کے بندے دن رات ـــ ان کاموں میں لگے ہوئے ہیں، کُنبے کو بھی کسی طرح سنبھال رہے ہیں، ملت کی کشتی بھی ڈوبنے سے بچا رہے ہیں۔

غرض! سب اکابر علماء اپنے اصاغر وتلامذہ کو برابر نصیحت کر رہے ہیں اور تسلی واطمینان دے کر تمام شعبہ ہائے اسلامی کو زندہ رکھنے میں بفضلہٖ تعالیٰ کامیاب بھی ہیں اس لئے آپ بھی اس مسئلے کی طرف توجہ دیں، مساجد کے خزانوں کو مضبوط کریں اور خدامِ مساجد، ائمہ، خطباء ومؤذنین کے وظائف میں معقول اضافہ کریں، مسجد کمیٹیوں سے مطالبہ کریں اور انہیں ذمہ داری کے پورا کرنے پر مجبور کریں؛ اہل علم کو تو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس کی مانگ کریں مگر محلے کے بااثر اور تعلیم یافتہ لوگ اس مسئلے کو محلہ محلہ اٹھا سکتے ہیں اور ہر مسجد کے متولی کو توجہ دلا سکتے ہیں، کاش کہ جہاں آپ خیر کے بہت سے کام کر رہے ہیں اس اہم ترین نیکی کی طرف بھی توجہ دیں، جس کی برکت سے ہمارے مذہبی قائدین اور دین کے محافظ امن واطمینان کے ساتھ اپنی خدمات جاری رکھ سکیں گے۔

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہ

نسیبہ بنت حارث، انصار کے قبیلہ ابی مالک بن النجار سے تعلق رکھتی ہیں۔

قبول اسلام:

ہجرت سے قبل مسلمان ہوئیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدینہ تشریف آوری کے بعد انصار کی عورتوں کو ایک مکان میں بیعت کے لئے جمع کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان شرائط پر دروازہ پر بھیجا کہ ان سے اس شرط پر بیعت لیں کہ شرک نہ کریں گی، چوری اور زنا سے بچیں گی، اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر بہتان نہ باندھیں گی، اچھی باتوں سے انکار نہ کریں گی، عورتوں نے ان باتوں کو تسلیم کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر کی طرف ہاتھ بڑھیا اور عورتوں نے اپنے ہاتھ باہر نکالے جو بیعت کی علامت تھی اس کے بعد ام عطیہ نے پوچھا کہ اچھی باتوں سے انکار کرنے کے کیا معنی ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نوحہ اور ماتم نہ کرنا۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا عہد رسالت کے سات معرکوں میں شریک ہوئی، جن میں وہ مردوں کے لئے کھانا پکاتی، ان کے سامان کی حفاظت کرتی، مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کے مرہم پٹی کرتی تھیں (مسلم)

سن ۸ ہجری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا اور چند عورتوں نے ان کو غسل دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہلانے کی ترکیب بتلائی۔ (بخاری)

عہد خلافت راشدہ میں ان کا ایک بیٹا کسی غزوہ میں شریک تھا، بیمار ہو کر بصرہ آیا حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا مدینہ میں تھی، خبر ملی تو نہایت تیزی سے بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں؛ لیکن پہنچنے سے ایک دو دن قبل اس کا انتقال ہوگیا، یہاں آکر انہوں نے بنو خلف کے قصر میں قیام کیا، تیسرے روز انہوں خوشبو منگا کر ملی اور کہا کہ شوہر کے علاوہ اور کسی کے لئے تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرنا چاہئے۔ (بخاری، باب حداد المرأۃ علی غیر زوجھا)

اس کے بعد وہیں بصر میں مستقل سکونت پذیر ہوگئیں۔

---

*رفیق تصنیف دار الدعوۃ والارشاد، یوسف گوڑہ، حیدرآباد

فضل وکمالات:

چند ایک احادیث ان سے مروی ہیں، راویوں میں حسب ذیل اصحاب ہیں، حضرت انس، ابن سیرین، حفصہ بنت سیرین، اسماعیل بن عبدالرحمن بن عطیہ، عبدالملک بن عمیر، علی بن الاقمر، ام شراحیل رضی اللہ عنہم۔ صحابہ اور تابعین ان سے میت کو نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے۔

اخلاق:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہاء محبت کرتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان سے شفقت کا معاملہ فرماتے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے پاس صدقہ کی ایک بکری بھیجی تو انہوں اس کا کچھ گوشت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا، آپ گھر میں تشریف لائے تو کھانے کے لئے مانگا تو بولیں اور تو کچھ نہیں البتہ جو بکری آپ نے نسیبہ کے پاس بھیجی تھی اس کا گوشت رکھا ہے، آپ نے فرمایا: لاؤ؛ کیوں کہ وہ اس کے مستحق کے پاس پہنچ چکا ہے۔(الاصابہ فی تمییز الصحابہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ کے اعزہ واقارب سے بھی خاص تعلقات تھے، چنانچہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عطیہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں قیلولہ فرماتے تھے۔(الاصابہ)

احکامِ نبوی کی پوری پابند تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت میں نوحہ کی ممانعت کی تھی اس پر انہوں نے ہمیشہ عمل کیا، چنانچہ بیعت ہی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی فلاں خاندان کے لوگ میرے ہاں رہ چکے ہیں، اس لئے مجھ کو بھی ان کے ہاں جا کر رونا ضروری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خاندان کو مستثنی کر دیجئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خاندان کو مستثنی کر دیا(مجمع بحار الانوار) بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مستثنی کر دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ استثناء حضرت ام عطیہؓ کے لئے خاص تھا ورنہ اصلی مسئلہ تو نوحہ کے عدم جواز کا ہے، جیسا کہ لڑکے کی وفات اور اس پر سوگ کرنے کا حال اوپر گذر چکا ہے۔

حضرت رُبیّع بنت معوذ بن عفراءؓ

نام ونسب: نام ربیع، قبیلہ خزرج کے خاندان نجار سے تعلق رکھتے ہیں، سلسلۂ نسب یہ ہے، ربیع بنت معوذ بن حارث بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک، حضرت ربیع اور ان کے تمام بھائی عفراء کی اولاد سے مشہور ہیں، عفراء ان کی دادی تھیں(الاصابہ)

اسلام: ہجرت سے قبل مسلمان ہوئیں۔

نکاح: ایاس بن بکیر اللیثی سے شادی ہوئی صبح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے گھر تشریف لائے اور بستر پر بیٹھ گئے، لڑکیاں دف بجا بجا کر شہدائے بدر کے مناقب میں اشعار پڑھ رہی تھیں، اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی کچھ اشعار پڑھے، جن میں ایک یہ مصرع تھا۔

وفیھا نبی یعلم ما فی غد

اور ہم میں وہ نبی ہے جو کل کی بات جانتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نہ کہو (اور اس کے سوا جو کہتی تھیں وہ کہو)۔

عام حالات زندگی:

غزوات میں شرکت کیا کرتیں، زخمیوں کا علاج کرتیں، لوگوں کو پانی پلاتیں اور مقتولوں کو مدینہ پہنچاتی اور فوج کی خدمت کرتی تھیں، غزوہ حدیبیہ کے موقع سے موجود تھیں، جب وہ ربیعت رضوان کا واقعہ پیش آیا تو انہوں نے بھی آکر بیعت کی۔

۳۵ھ میں اپنے شوہر سے علیحدہ ہوئیں، شرط یہ تھی کہ جو کچھ میرے پاس ہے اس کو لے کر مجھ سے دست بردار ہو جاؤ، چنانچہ اپنا تمام سامان ان کو دے دیا صرف ایک کرتی رہنے دی؛ لیکن شوہر کو یہ بھی گوارا نہ ہوا، جا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا؛ چونکہ ربیع نے کل چیزوں کی شرط کی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں اپنے وعدہ کی تکمیل کرنے ہوگی، شوہر سے فرمایا کہ تم ان کے جوڑا باندھنے کی دھجی بھی لے سکتے ہو۔ (مسند احمد: ۶/۳۵۸)

اولاد میں محمد مشہور ہیں۔

فضل وکمال:

حضرت ربیع رضی اللہ عنہا سے ۲۱ حدیثیں مروی ہیں، علمی حیثیت سے ان کا یہ پایہ اور مقام تھا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے، راویوں میں بہت سے بڑے بزرگ شامل ہیں، جن میں عائشہ بنت انس بن مالک، عبداللہ بن محمد بن عقیل، عبیدہ بن محمد (حضرت عمار بن یاسر کے پوتے) محمد بن عبدالرحمن بن ثوبان رضی اللہ عنہم۔

دین سے جذباتی تعلق:

جوش ایمان اس قدر زیادہ تھا کہ ایک مرتبہ اسماء بنت مخرمہ جو ابوربیعہ مخزومی کی بیوی تھیں اور عطر بیچتی تھیں چند عورتوں کے ساتھ ربیع کے گھر آئیں اور ان کا نام ونسب دریافت کیا چونکہ ربیع کے والد نے ابوجہل کو بدر میں

قتل کیا تھا اور اسماء قریش کے قبیلے سے تھیں بولیں: تم تو ہمارے سردار کے قاتل کی بیٹی ہو، حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کو ابو جہل کی نسبت سردار کا لفظ نہایت گراں گذرا، بولیں، سردار کی نہیں؛ بلکہ غلام کے قاتل کی بیٹی ہو؟ اسماء کو ابوجہل کی شان میں یہ گستاخی پسند نہ آئی جھنجلا کر کہا کہ مجھ کو تمہارے ہاتھ سودا بیچنا حرام ہے، حضرت ربیع رضی اللہ عنہا نے برجستہ کہا: مجھ کو تم سے کچھ خریدنا حرام ہے، کیوں کہ تمہارا عطر، عطر نہیں بلکہ گندگی ہے (اسد الغابۃ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت تھی، آپ ان کے گھر اکثر تشریف لے جاتے تھے، ایک مرتبہ آپ تشریف لائے اور ان سے وضو کے لئے پانی مانگا، ایک مرتبہ وہ دو طباقوں میں چھوہارے اور انگور لے کر گئیں تو آپ نے زیور یا سونا مرحمت فرمایا۔ (مسند احمد)

ایک مرتبہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ دریافت کیا تو بولیں: بس یہ سمجھ لو کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہے (اسد الغابۃ)

گوشۂ خواتین

عظمتِ خواتین اور اسلام

حضرت مولانا محمد اسرار الحق قاسمی*

فی زمانہ اسلام اور مسلمانوں پر الزامات کے شدیدے حملے کیے جارہے ہیں۔الزامات کے یہ حملے میڈیا کے ذریعے کیے جارہے ہیں۔ چاہے پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک۔ دونوں کے توسط سے اسلام کو بدنام کرنے کا عمل جاری ہے۔ مارکیٹ میں ایسی بہت سی کتابیں موجود ہیں، جن میں اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ٹی وی پر روز بروز اسلام پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ ڈبیٹس کے نام پر مسلمانوں کو کوسا جاتا ہے اور اسلام کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہوتا ہے۔ جان بوجھ کر ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے جن پر سوالات اٹھائے جاسکیں اور ڈبیٹس میں حصہ لینے والے مسلمانوں کو گھیر کر لاجواب کیا جاسکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلام کی نمائندگی کرنے کے لیے عام طور پر ان علما کو دعوت دی جاتی ہے جن کا مطالعہ محدود ہوتا ہے یا جو اختصار کے ساتھ عقلی اور نقلی دلائل سے اپنی بات کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسرے شرکا کے ذریعے اٹھائے جانے والے سوالات کا جواب نہیں دے پاتے۔ اس پر مزید ستم یہ ہوتا ہے کہ ٹی وی اینکر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ بھی بڑھ چڑھ کر سوال کرتا ہے اور علما کو لاجواب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بعض علما صحیح انداز سے جواب دیتے ہیں اور اپنی بات کو متاثر کن اور ٹھوس دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو ان کی بات کو اینکر کاٹ دیتا ہے اور دوسرے مخالف شریکِ بحث کی طرف چلا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ مسلمانوں کو لاجواب اور اسلام کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ناظرین یہ اندازہ لگالیں کہ مسلمانوں اور اسلام کے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور اسلام کمزور مذہب ہے۔ ٹی وی چینلوں پر ایسی درجنوں بحثیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہ وقت بڑا صبر آزما ہے کہ وہ مخالف ماحول میں کیا کریں؟

جن موضوعات کو آج کل زیر بحث لایا جارہا ہے، ان میں بعض کا تعلق عورتوں سے ہے۔ خواتین کے حوالے سے کبھی تین طلاق، کبھی حلالہ، کبھی برقع اور کبھی دوسرے پہلوؤں پر بحثیں کرکے یہ دکھایا جاتا ہے کہ مسلم

*صدر آل انڈیا تعلیمی ملی فاؤنڈیشن

معاشرے میں عورتیں مظلوم ہیں۔ان پر ظلم وتشدد کیا جاتا ہے،حلالہ کی آڑ میں ان کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے، انھیں تعلیم حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے،ان کو ترقی نہیں کرنے دی جاتی،انھیں گھروں میں قید کرکے رکھا جاتا ہے،زبردستی برقع پہنایا جاتا ہے اور بات بات پر انھیں مارا پیٹا جاتا ہے۔یہ تاثرات ٹی وی پر ہونے والے مباحثوں سے سامنے آتے ہیں اور سوشل میڈیا پر بھی اسی طرح کی باتیں کی جاتی ہیں۔بات صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ درپردہ اسلام کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام نے عورتوں کو عزت نہیں دی اور انھیں ترقی سے روکا ہے۔مباحثوں اور اس طرح کے پروپیگنڈے کا اثر یہ ہے کہ غیر مسلم سوسائٹیوں میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمان عورتوں پر تشدد کے پہاڑ توڑتے ہیں اور اسلام میں عورتوں کے لیے اہم مقام نہیں ہے۔یہ خیالات صرف ناخواندہ افراد کے نہیں ہیں، بلکہ تعلیم یافتہ حضرات کے بھی ہیں اور ان طلبا وطالبات کے بھی جو کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔حد تو یہ ہے کہ اس طرح کے رجحانات اب بہت سے ان مسلمانوں کے بھی بنتے جارہے ہیں جو غیر اسلامی ماحول میں رہتے ہیں اور اسلامی تعلیم ان کے پاس نہیں ہے۔

قرآن وحدیث کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ اسلام نے خواتین کو اعلیٰ مقام سے نوازا ہے' ان کا حد درجہ خیال رکھا ہے' ان کو کامیاب کرنے کے مواقع دیے ہیں اور ماحول کو ان کے لیے ساز گار کیا ہے' اگر خواتین کی عظمت وحقوق کی بات اسلام اور دیگر مذاہب کے تناظر میں کی جائے تو اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہوگا کہ اسلام نے دیگر مذاہب سے زیادہ عورت کا احترام کیا ہے،اسے عزت دی ہے اور اسے فلاح یاب کرنے کے لیے بہترین تعلیمات پیش کی ہیں۔اگر صنف نازک کے حوالے سے اسلام کے مقابلے جدید نظریات کو دیکھا جائے اور حقوق انسانی کی بات کرنے والی تنظیموں کے خیالات کا جائزہ لیا جائے تو وہ اسلام کے مقابلے میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔

بعثتِ اسلام سے قبل عورتوں کے ساتھ نہایت سوتیلا برتاؤ کیا جاتا تھا اور اس وقت موجود مذاہب خواتین کے تحفظ میں ناکام ثابت ہورہے تھے بلکہ ان کے بعض خیالات خواتین کی بابت ایسے تھے جن سے خواتین کے مقام پر ضرب لگتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی،اسلام نے عورتوں کے بارے میں پاکیزہ تعلیمات پیش کیں اور اُنھیں سماج میں مساوی حقوق عطا کیے،اگر وہ بچیاں ہیں تو اسلام میں ان کی پرورش وتربت پر توجہ دلائی گئی اور اس کی فضیلتیں بیان کی گئیں۔بعثتِ اسلام سے قبل عرب کے معاشرے میں نومولود بچیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا،اسلام نے اس مجرمانہ روایت کو یکسر ختم کردیا اور بچیوں کی پرورش پر خاصی توجہ دلائی،دورانِ پرورش

لڑکے اور لڑکی کے درمیان کسی بھی طرح کی تفریق سے منع کیا، جب لڑکیاں بڑی ہوئیں اور ان کی شادی ہوگئی تو اسلام نے شوہروں کو تاکید کی: ''وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ'' اوران کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرو۔ شوہروں کے ذمے ان کا نان ونفقہ متعین کیا کہ شوہر کمائے اور اپنی بیوی کے اخراجات کو پورا کرے۔یعنی عورتوں کو کمانے کے دوران آنے والی بہت سی پریشانیوں سے محفوظ کردیا گیا۔وہ آرام سے گھر میں رہ سکتی ہیں اور کمانے کی فکر سے آزاد ہیں۔اس کے باوجود اگر وہ تجارت وملازت کرنا چاہتی ہیں تو انھیں اسے روکا بھی نہیں گیا۔اچھے ماحول میں وہ تجارت وملازت بھی کرسکتی ہیں۔غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ انھیں تجارت وغیرہ کی بھی اجازت ہے کہ وہ معاشی ترقی کرسکتی ہیں اور اگر وہ معاشیات کے حصول کے لیے بہت سے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتیں تو یہ ان کے اوپر ہے۔شوہر توان کا خرچ پورا کرنے والا ہی ہے۔یہ نظریہ عورتوں کے حق میں ہے لیکن معاندینِ اسلام اس نظریے کو عورت مخالف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام عورتوں کو گھروں میں قید کردیتا ہے، انھیں ملازمت نہیں کرنے دیتا اور آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔اسے ذہنی فساد ہی کہا جاسکتا ہے کہ مثبت بات کو منفی بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔

جب عورت ماں بنتی ہے تو اسے اور اہم مقام عطا ہوتا ہے۔اس کے درجات کو بلند کردیا جاتا ہے، خاندان میں اس کی عزت مزید دوبالا ہوتی ہے، ایک طرف وہ اپنے شوہر کی چہیتی ہوتی ہے، وہ اس کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کے حقوق کا خیال رکھتا ہے، اس کو خرچ دیتا ہے، دوسری طرف اس کے بچے اس کا احترام کرتے ہیں، خدمت کرتے ہیں اور بہترین سلوک کرتے ہیں، اسلام میں ماں کے مقام ومنصب کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار ایک صحابی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معلوم کرنے لگے کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امک، (تیری ماں)، اس کے بعد ان صحابیؓ نے دوبارہ سوال کیا کہ ثم من ؟ پھر کون۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثم امک (پھر تیری ماں) اس کے بعد صحابیؓ نے عرض کیا ثم من ؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ثم امک، پھر تیری ماں، اس کے بعد صحابیؓ نے معلوم کیا ثم من ؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ثم اباک ادناک۔پھر تیرے باپ اور رشتہ دار۔

غور کیجیے! حسن سلوک کی پہلی حق دار ماں ہے۔دوسرے نمبر پر بھی ماں ہے۔تیسرے نمبر پر بھی ماں ہے اور چوتھے نمبر پر باپ، پھر دیگر اعزاواقارب۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ترجیحی طور پر اپنی والدہ کی خدمت کرے اور اس کے ساتھ حسن کا معاملہ کرے۔عورتوں کو تینوں حیثیتوں میں خاصی

اہمیت دی گئی۔یعنی جب وہ بچی تھی،تب اس کا خیال رکھا گیا۔جب وہ شادی شدہ ہوئی تو اس کو عزت عطا کی گئی اور جب وہ ماں بنی تو اس کو احترام واعزاز سے نوازا گیا۔

اگر ابدی کامیابی کے لحاظ سے عورتوں کی بات کریں تو عورت کو وہ تمام چیزیں عطا کی گئیں جو مردوں کو دی گئیں۔مثال کے طور پر پانچ وقت کی نماز مردوں پر فرض کی گئی تاکہ وہ ''وماخلقت الجن والانس'' پر پورے اتر سکیں اور اپنے مقام ومنصب کو بڑھا سکیں تو عورتوں کو بھی پانچ وقت کی نمازیں دی گئیں۔ایک بھی کم نہیں کی گئی اور نہ زیادہ۔مردوں پر رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض کیے گئے۔اس طرح عورتوں پر بھی رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض کیے گئے۔زکوۃ صاحبِ نصاب مردوں پر فرض کی گئی تو صاحبِ نصاب عورتوں پر بھی زکوۃ فرض کی گئی۔قربانی صاحب نصاب مردوں پر واجب ہے تو صاحبِ نصاب عورتوں پر بھی واجب ہے۔اسی طرح حج بیت اللہ ان مسلمانوں پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے جو من استطاع الیہ سبیلاً کے تحت آتے ہیں۔تو جو عورتیں اپنے پاس اتنی مالیت رکھتی ہیں یا اتنی طاقت رکھتی ہیں کہ مکہ پہنچ سکیں تو ان پر بھی حج پر فرض ہے۔گویا کہ ہر جگہ اسلام نے عورتوں کو مساویانہ حقوق عطا کیے۔عزت کا معاملہ ہو یا عبادت کا معاملہ،ہر جگہ عورتوں کو اہمیت دی گئی۔اور اگر کہیں کوئی رخصت دی گئی تو وہ ان کی سہولتوں کے لیے۔اور اگر کسی چیز کا انھیں پابند بنایا گیا تو ان کے فائدے کے لیے جیسا کہ پردے کے معاملے کو لے لیجئے۔'پردہ' عورت کے حق میں ہے،مخالفت میں نہیں۔عورت اس طرح بہت سی ہوس ناک نظروں سے محفوظ ہو جاتی ہے اور بہت سی خطرناک وارداتوں سے تحفظ کا بھی پردہ ذریعہ ہے۔یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ آج کا میڈیا عورتوں کے تعلق سے اسلام کی تعلیمات کو غلط طور پر پیش کر رہا ہے اور انھیں ورغلا ہو رہا ہے۔انھیں آزادیٔ نسواں کے نام پر غیر محفوظ کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ان کو جرائم کا شکار بنانا چاہتا ہے۔عورتوں کو بڑی سنجیدگی سے سوچنا چاہئے کہ کیا چیز ان کے حق میں ہے اور کیا چیز ان کی مخالفت میں ہے۔دورِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں رچی جا رہی ہیں ان سے بھی چوکنا رہنا چاہئے اور یہ بات ذہن میں بٹھانی چاہیے کہ اسلام کسی کے ساتھ ناانصافی وزیادتی نہیں کرتا ہے۔جو لوگ اسلام کے خلاف باتیں بنا رہے ہیں،انھیں یا تو اسلام کی تعلیمات سے کماحقہ واقفیت نہیں یا پھر وہ عناد اور دشمنی میں ایسا کر رہے ہیں۔اسلام کی تعلیمات کے سنجیدہ مطالعے سے حقیقتِ حال خود واضح ہو جاتی ہے۔اس لیے دوسروں کے الزامات یا باتوں پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ خود اسلام کا مطالعہ کیا جائے اور عورتوں کے تعلق سے اسلام کیا باتیں پیش کرتا ہے،ان کو گہرائی سے دیکھا جائے۔

اصلاحی مضامین

حیا اور پاک دامنی وقت کی اہم ترین ضرورت

مولانا محمد ریاض قاسمی منچریال

کچھ دن پہلے تک بھی لیلیٰ مجنوں جیسے کردار صرف کتابوں کے اوراق میں مدفون تھے؛ لیکن آج کل اکثر و بیشتر جس نوجوان کو بھی اندر سے ٹٹولا جائے تو ہر لڑکا کسی لیلیٰ کا مجنوں اور ہر لڑکی کسی مجنوں کی لیلیٰ نظر آتی ہے، بات صرف یہاں آ کر رک نہیں جاتی؛ بلکہ اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایسی ہیں کہ ان کی کھوئی ہوئی آنکھیں، اڑا اڑا رنگ، اترے چہرے، پریشان خیالات، حیران کن سوچ، افسردہ نگاہیں اور غمگین اندازِ گفتگو یہ سب مل کر ان کے بدحال دل کا افسانہ بیان کرتے ہیں؛ کیوں کہ وہ ایک ایسے راستے پر چل پڑے ہیں جس کی کوئی منزل نہیں، وہ ایک ایسے سمندر میں غرق ہیں جس کا کوئی کنارہ نہیں، وہ ایک ایسے سیلاب کی زد میں ہیں جو کبھی تھمنے والا نہیں اور وہ ہے بے حیائی اور بے پردگی کا سیلاب، وہ ہے ہوس پرستی اور عیش پرستی کا سمندر، وہ ہے نفسانیت اور عیش رانی کا سفینہ، ان سب کے باوجود ان کے دل و دماغ میں یہی رہتا ہے کہ زندگی چار دن کی ہے، اسلئے خوب جی لو

نو روز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(ترجمہ) نوروز ہے، نو بہار ہے، مے ہے، خوبصورت محبوب ہے، بابر بس عیش کی سعی ہی میں لگا رہ کہ دنیا دوبارہ نہیں ہے۔

اسی عیش کوشی اور فیشن پرستی کے نام پر مرد و عورت کے لباس میں تبدیلی آ رہی ہے، ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی کرتے ہوئے حدودِ شریعت کو پھلانگ کر آزادی کی ہوا میں سانس لینا وقت کا تقاضہ بن چکا ہے، ویسے تو اسلام میں زیب و زینت کی مخالفت نہیں کی گئی؛ مگر اس کے بھی کچھ حدود و قیود متعین ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مرد، عورت معلوم ہو اور عورت مرد محسوس ہو۔

آج مغربی ممالک میں آزادیِ نسواں کے نام پر عورت کا بری طرح سے استحصال کیا جا رہا ہے اور مساواتِ مرد و زن کا نعرہ لگانے والے خود عورتوں کا مذاق اڑاتے نظر آ رہے ہیں، آپ کے سامنے ایک ایسی

رپورٹ پیش کی جائے گی جس سے پتہ چلے گا کہ آزادیٔ نسواں حقیقت ہے یا فریب؟

’’امریکہ میں کام کرنے والوں کے درمیان عورتوں کی تعداد چالیس فیصد ہے، مگر امریکہ کے ساڑھے تین لاکھ سائنس دانوں میں خواتین کی تعداد صرف دس فیصد ہے اور اعلیٰ سائنسی عہدوں پر بہت کم خواتین فائز ہیں، مثلاً نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب ممبروں کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہے جس میں خواتین صرف نو ہیں، نوبل انعام پانے والے 278 لوگوں میں صرف 6 عورتیں ہیں۔ (ٹائم میگزین ۲۰ مارچ ۱۹۷۲)

یہ تو صرف سائنس سے متعلقہ افراد تھے، اگر آپ ہر فیلڈ میں دیکھیں گے تو یہ محسوس ہوگا کہ وہاں خواتین کا نام ونشان نہیں ہے حتی کہ سپریم کورٹ جو سب کے لئے یکساں کام کرتا ہے اور سب کو ایک درجے کا شہری مانتا ہے اسی سپریم کورٹ کی عمارت پر یہ فقرہ لکھا ہے: ’’قانون کے تحت یکساں انصاف‘‘ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ امریکی عورت پر مشکل سے چسپاں ہوتے ہیں کیوں کہ سپریم کورٹ میں نہ ماضی میں کوئی خاتون جج تھی اور نہ اب ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے وہ چالیس فیصد خواتین کہاں کام کرتی ہیں؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ خواتین کے کام کرنے کی جگہیں مختلف ہیں، وہ صدرِ محفل نہیں بلکہ شمعِ محفل بنائی جاتی ہیں، وہ صدر نشیں نہیں بلکہ بستر نشین بنائی جاتی ہیں، وہ ضرورت محفل نہیں بلکہ آرزوئے محفل بنائی جاتی ہیں، وہاں مردوں کی اس دنیا میں عورتیں اب بھی صرف ایک روایتی درجہ رکھتی ہیں، وہ صرف ایسے شعبوں میں جوش وخروش سے لی جاتی ہیں جو صرف عورتوں پر انحصار رکھتے ہوں یا صرف ان میں لی جاتی ہیں جس سے کمپنی کی آمدنی دوگنا ہوتی نظر آئے جیسے فیشن، ایکٹنگ ڈینسنگ اور کال سنٹرز وغیرہ وغیرہ۔

مغربی مفکرین نے بے حیائی کے جس پودے کو لگایا، جس درخت کو تناور بنایا آج وہ خود اس سے پریشان ہیں؛ مگر کیا فائدہ کہ اب ان کی دیکھا دیکھی کرنے والے گونگے بہرے اور اندھے بن کر ان کی ناجائز تقلید میں پڑے ہوئے ہیں۔

اگر اس مغربی تہذیب سے چھٹکارا پانا ہے تو دامنِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں پناہ حاصل کرنی ہوگی، اگر اس سیلاب سے بچنا ہے تو کشتیِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں سوار ہونا ہوگا، اگر اس مکر وفریب کے جال سے نکلنا ہے تو فاطمہ کے دامنِ حیا میں جگہ حاصل کرنی ہوگی، حیا کو زندگی کا اہم جز تسلیم کر کے اسے اپنانا ہوگا اور حیا کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا کیونکہ حیا ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے انسان، انسان باقی رہتا ہے ورنہ وہ انسانوں کے زمرے سے نکل کر حیوانوں کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیان فرمایا ہے: إذا فاتك الحياء فاصنع ما شئت (جب تمہارے اندر حیا نہ ہو تو جو چاہے کرو)۔

اصلاحی مضامین

سالِ نو کا جشن اور اسلامی تعلیمات

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

زندگی اللہ پاک کا عظیم عطیہ اور قیمتی امانت ہے؛ اس کا درست استعمال انسان کے لیے دنیوی کامیابی اور اخروی سرفرازی کا سبب ہے اور اس کا ضیاع انسان کو ہلاکت و بربادی کے دہانے تک پہونچا دیتا ہے۔ قیامت میں انسان کو اپنے ہر قول و عمل کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے پورا حساب دینا ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کسی بھی عمل کو انجام دینے سے پہلے اس بات پر بہ خوبی غور کر لے کہ اس عمل کے ارتکاب کی صورت میں وہ کل کیا صفائی پیش کرے گا اور اپنے معبود حقیقی کو کیا منہ دکھائے گا؟؟۔ آج مسلمانوں نے دیگر اقوام کی دیکھا دیکھی بہت سی ان چیزوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا اور انہیں اپنے لیے لازم وضروری سمجھ لیا؛ جو دین ودنیا دونوں کی تباہی و بربادی کا ذریعہ ہیں، ان ہی خرافات اور ناجائز رسومات میں " سال نو کا جشن" بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

ایک سال کا اختتام اور دوسرے سال کا آغاز اس بات کا کھلا پیغام ہے کہ ہماری زندگی سے ایک سال کم ہوگیا، حیات مستعار کا ایک ورق الٹ گیا اور ہم موت کے مزید قریب ہوگئے، اس لحاظ سے ہماری فکر اور ذمہ داری اور بڑھ جانی چاہیے، ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی اور وقت کو منظم کر کے اچھے اختتام کی کوشش میں لگ جانا چاہیے اور اپنا محاسبہ کر کے کمزوریوں کو دور کرنے اور اچھائیوں کو انجام دینے کی سعی کرنی چاہیے؛ مگر افسوس صد افسوس! اس کے برعکس دیکھا یہ جاتا ہے کہ عیسوی سال کے اختتام اور نئے سال کے آغاز پر مغربی ممالک کی طرح ہمارے ملک کے بہت سارے مسلم اور غیر مسلم بالخصوص نوجوان لڑکیاں اور لڑکے، دھوم دھام سے خوشیاں مناتے ہیں، آتش بازی کرتے ہیں، کیک کاٹتے ہیں اور ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارک باد پیش کرتے ہیں پھر اظہار مسرت کے اس بے محل موقع پر وہ جائز اور مناسب حدود سے نکل کر بہت سے ایسے کام بھی کرتے ہیں؛ جنہیں ایک سلیم العقل انسان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا، اور نہ ہی انسانی سماج کے لیے وہ کام کسی طرح مفید ہیں؛ بلکہ نگاہ بصیرت سے دیکھا جائے تو حد درجہ مضر ہیں۔ مثال کے طور پر (۳۱) ڈسمبر اور یکم جنوری

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

کے بیچ کی شب میں نئے عیسوی سال کے آغاز کی خوشی مناتے ہوئے جگہ جگہ قمقمے روشن کئے جاتے ہیں، رنگ بہ رنگی تقاریب کا اہتمام ہوتا ہے، ناچنے گانے والیوں کو بلا کر رقص وسرود کی محفلیں جمتی ہیں اور ان حرام کاموں پر بے تحاشہ پیسہ خرچ کیا جاتا ہے۔ بہت سارے نوجوان اس رات شراب و کباب کا جم کر استعمال کرتے ہیں اور اس غلط کام پر بھی بے دریغ پیسہ صرف کرتے ہیں، ہم نہیں سمجھتے کہ شراب نوشی کی کسی بھی مذہب میں کوئی گنجائش ہوگی، یہ انسانی عقل کو سلب کر کے آدمی کو بالکل ناکارہ بنادیتی ہے، اور اس کے نشہ میں چور آدمی قتل وغارت گری، زناکاری و بدکاری اور بہت ساری دوسری برائیوں کا بلا جھجک ارتکاب کرتا ہے۔

الغرض: پرانے سال کے اختتام اور نئے سال کے آغاز پر یعنی 31 دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب فحاشی اور عریانی کی تمام حدوں سے گزر جانے، بے دریغ مال واوقات کا ضیاع کرنے نیز مذہبی واخلاقی پابندیوں کو پاؤں تلے روند ڈالنے، بلکہ حیوانیت کا گندا مظاہرہ کرنے کو فی زمانہ نیو ایئر سیلی بریشن سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس میں متعدد گناہوں کے ساتھ اسراف وفضول خرچی، کفار ومشرکین کی تقلید، نعمتِ خداوندی کی ناقدری اور وقت کا ضیاع جیسے بیشتر امور بھی شامل ہیں۔

جشن سال نو؛ آغاز وارتقاء:

دیگر بہت سی خرافات کی طرح یہ رسم بد بھی یہود ونصاری کی دین ہے؛ جو مسلمانوں میں فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو عام کرنے کے لیے ایجاد کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ نئے عیسوی سال کا جشن پہلی بار 1/ جنوری 1600 عیسوی کو، اسکاٹ لینڈ میں منایا گیا، اس لیے کہ عیسائی اسی سے نئے سال کی ابتدا مانتے ہیں، جب کہ یہ تاریخ مروجہ میلادِ مسیح سے مختلف ہے؛ یعنی میلادِ مسیح 25/ دسمبر اور نئے سال کا آغاز اس کے ایک ہفتے بعد 31 دسمبر۔ پھر عصرِ حاضر میں نئے سال کا جشن ایک اہم تقریب کے طور پر عیسائی وغیر عیسائی ممالک میں جدید مغربی تہذیب کے مطابق 31 دسمبر کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رات کے 12 بجے منعقد کیا جانے لگا، جس میں مسلمان بھی دھڑلّے سے شریک ہوتے اور اسلامی تہذیب وثقافت اور نبوی تعلیمات کی دھجیاں اڑاتے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اہل اسلام خود جائزہ لیں کہ جو مذہب، اسلامی سال کی آمد پر بھی آپس میں مبارک بادی وغیرہ کی تاکید نہیں کرتا کہ کہیں اس طرح کی مبارک بادی آہستہ آہستہ مستقل بدعت کی شکل اختیار نہ کر جائے، وہ غیر اسلامی سال پر جشن منانے اور مبارک بادی دینے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟؟۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس سال مدینہ منورہ میں رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تیس سال خلافتِ راشدہ کا عہد رہا، صحابہ کرامؓ کی نگاہ میں اس واقعے کی اتنی اہمیت تھی کہ اسی کو اسلامی کیلنڈر کی بنیاد واساس بنایا گیا اور حضرتِ عمرؓ کے عہد سے ہی ہجری تقویم کو

اختیار کرلیا گیا، لیکن ان حضرات نے کبھی سالِ نو یا یومِ ہجرت منانے کی کوشش نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اس طرح کے رسوم ورواج کا قائل نہیں ہے، کیوں کہ عام طور پر رسمیں نیک مقصد اور سادہ جذبے کے تحت وجود میں آتی ہیں، پھر وہ دھیرے دھیرے دین کا جزو بن جاتی ہیں، اس لیے اسلام کو بے آمیز رکھنے کے لیے ایسی رسموں سے گریز کرنا ضروری ہے۔" (ملخص از کتاب الفتاویٰ)

اسلام میں نئے سال کی ابتداء پر یوں مادر پدر آزاد ہوجانے کی کوئی اجازت نہیں اور المیہ یہ ہے کہ آج ہم پر مغربی ثقافت کا ایسا رنگ چھایا ہم بھول ہی گئے کہ اسلامی سال کی ابتداء محرم کے مہینے سے ہوتی ہے اور اختتام ذوالحجہ کے مہینے پر ہوتا ہے- ہمارے کیلنڈروں پر انگریزی تاریخ ہی درج ہوتی ہے، دفاتر میں انگریزی تاریخ والا کیلنڈر، ملازمین کی تنخواہیں اسی کیلنڈر کے مطابق، چھٹیاں بھی ان ہی تاریخوں کے حساب سے، گویا کہ اسلامی مہینوں کی تاریخیں محض رمضان المبارک اور عیدین کے ساتھ ہی معلق ہوکر رہ گئی۔ جبکہ اسلامی مہینوں کی بنیاد چاند کے گھٹنے اور بڑھنے پر ہے جس کا ادراک ایک عام ان پڑھ آدمی بھی کرسکتا ہے پھر دوسری طرف اسلامی مہینوں کے نام شریعت نے وضع کئے اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کو ان کی بنیاد قرار دیا گویا کہ اسلامی سال اور مہینوں کا نظام ایک باقاعدہ ترتیب شدہ اور اعلی ومعیاری ہے اور ہم ہوش مند مسلمانوں نے معیاری چیز کو چھوڑ کر غیر معیاری اور گھٹیا چیز کو سینے سے لگالیا عیسائی ثقافت کو اسلامی ثقافت پر ترجیح دی اور پھر ان کی نقالی نے ہم سے غیرت وحیا بھی چھین لی کہ ہم ان کے پیچھے چلتے ہوئے ان ہی کے انداز میں ہپی نیوایئر کے نعرے لگانے، بدن سے کپڑے نوچ پھینکنے اور طرح طرح کی خرافات انجام دینے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے میں
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

خود احتسابی کی ضرورت:

غور کیا جائے تو نیا سال ہمیں دینی اور دنیوی دونوں میدانوں میں اپنا محاسبہ کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا جو ایک سال کم ہوگیا ہے اس میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ کیوں کہ وقت کی مثال تیز دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی اس سِل سے دی جاتی ہے؛ جس سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو بہتر ورنہ وہ تو بہر حال پگھل ہی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دو نعمتوں کے بارے میں اکثر لوگ خسارے میں رہتے ہیں: صحت اور فراغت۔" (بخاری، کتاب الرقاق)

اللہ تعالیٰ انسان کو جسمانی صحت اور فراغت اوقات کی نعمتوں سے نوازتا ہے تو اکثر سمجھتے ہیں کہ یہ نعمتیں ہمیشہ رہنی ہیں اور ان کو کبھی زوال نہیں آنا حالانکہ یہ صرف شیطانی وسوسہ ہوتا ہے۔ جو رب کائنات ان عظیم نعمتوں سے نوازنے والا ہے وہ ان کو کسی وقت بھی چھین سکتا ہے لہٰذا انسان کو ان عظیم نعمتوں کی قدر کرتے ہوئے انھیں بہتر استعمال میں لانا چاہیے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں عبادات، معاملات، اعمال، حلال وحرام، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے میدان میں اپنی زندگی کا محاسبہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ ہم سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں؛ اس لیے کہ انسان دوسروں کی نظروں سے تو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو چھپا سکتا ہے؛ لیکن خود کی نظروں سے نہیں بچ سکتا؛ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: تم خود اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا احساب کیا جائے۔ (ترمذی شریف) اس لیے ہم سب کو ایمان داری سے اپنا اپنا مواخذہ اور محاسبہ کرنا چاہیے اور ملی ہوئی مہلت کا فائدہ اٹھانا چاہیے؛ اس سے پہلے کہ یہ مہلت ختم ہو جائے۔ اپنی خود احتسابی اور جائزے کے بعد اس کے تجربات کی روشنی میں بہترین مستقبل کی تعمیر اور تشکیل کے منصوبے میں منہمک ہونا ہوگا کہ کیا ہماری کمزوریاں رہی ہیں اور ان کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ دور نہ سہی تو کیسے کم کیا جا سکتا ہے؟

انسان غلطی کا پتلا ہے اس سے غلطیاں تو ہوں گی ہی، کسی غلطی کا ارتکاب تو برا ہے ہی اس سے بھی زیادہ برا یہ ہے کہ اس سے سبق حاصل نہ کیا جائے اور اسی کا ارتکاب کیا جاتا رہے۔

یہ منصوبہ بندی دینی اور دنیوی دونوں معاملات میں ہو جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت جان لو! ۱) اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے۔ ۲) اپنی صحت وتندرستی کو بیماری سے پہلے۔ ۳) اپنی مالداری کو فقر وفاقے سے پہلے۔ ۴) اپنے خالی اوقات کو مشغولیت سے پہلے۔ ۵) اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔ (مشکوٰۃ شریف)

خلاصہ یہ ہے کہ ہر نیا سال خوش گمانیوں اور بھول بھلیوں میں گم کرنے کے بجائے ایک حقیقی انسان کو بے چین و بے کل کر دیتا ہے، اس سے پہلے کہ زندگی کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے کچھ کر لینے کی تمنا اس کو بے قرار کر دیتی ہے اس کے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اس کو اس بات کا احساس دامن گیر رہتا ہے کہ میری عمر رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے اور میں آہستہ آہستہ منزل مقصود سے قریب ہو رہا ہوں۔ ایسا شخص کس بات پر خوشی منائے گا؟ کس بات کا جشن کرے گا؟ کیوں کر وقت اور مال کا ضیاع کرے گا؟ بل کہ وہ تو یہ سمجھے گا کہ یہ گزرتے ہوئے وقت کی قدر کرنے اور آنے والے لمحاتِ زندگی کے صحیح استعمال کے عزم وارادے کا موقع ہے نیز از سر نو عزائم کو بلند کرنے، خامیوں کو دور کرنے اور حوصلوں کو پروان چڑھانے کا وقت ہے۔

دردمندانہ گزارش:

انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا مقصد ''خالق کائنات کی بندگی'' (الذاریات،56:51) قرار دیا گیا ہے، یہ ہر انسان کی تخلیق کا مقصد ہے اور جو مسلمان ہو تو اس پر عام انسانوں کی نسبت ذمہ داری بڑھ جاتی ہے؛ کیونکہ کسی بھی مسلمان کا مقصد خالق کائنات کی بندگی کے ساتھ اپنے آقا و مولی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور مذہب اسلام کی سچی نمائندگی ہے۔ ان سے بڑھ کر علماء کرام تو انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اس حیثیت سے ان کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے؛ لہذا بڑے ہی عجز و نیاز کے ساتھ ملت اسلامیہ کے امینوں و پاسبانوں اور عقائد و اعمال کے محافظوں اور نگہبانوں سے گزارش ہے کہ خدارا! ان نوجوانوں کی حالت زار پر رحم کیجیے، انہیں ان کے متاع گمشدہ سے روشناس کرائیے!! انہیں ان کے اسلاف کی زندگیوں سے واقف کرائیے!! حضرت خباب و بلال کے عزم و حوصلوں کو بیان فرمائیے!!، تاریخ و سیرت، مدنیت و سیاست، قانون و قیادت کے روشن ترین اسلامی ابواب ان کی گھٹی میں پیوست کر دیجیے!! زعماء و قائدین اور اولیاء و سرپرستان سے ملاقات فرمائیے! مل کر باہمی گفت و شنید کے ذریعہ انہیں اس ایمان سوز عمل سے باز رہنے کی تاکید فرمائیے۔

رحمت کا ابر بن کر جہاں بھر میں چھائیے
عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے

اصلاحی مضامین

پاروں کا ثبوت خیر القرون سے اور ۱۴/ ویں پارہ کی ابتداء کی تحقیق

از: مفتی رشید احمد فریدی*

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد

تمہید و پس منظر

''ترتیب وتدوین قرآنی'' کے عنوان سے دو صفحہ پر مشتمل ایک مضمون نظر سے گذرا جس میں قرآن کے پاروں کی ابتداء کے بارے میں نقد کیا گیا اور مختلف دس پاروں کی ابتداء کو غلط قرار دیا گیا پھر کچھ عرصے بعد صاحب مضمون نے ان دس پاروں پر مزید چار کا اضافہ کرکے ۵/ ۶/ ۷/ ۸/ ۹/ ۱۱/ ۱۲/ ۱۳/ ۱۴/ ۱۶/ ۲۰/ ۲۲/ ۲۳/ ۲۷/ کل چودہ پاروں کی ابتداء کو قابل اصلاح قرار دیا بلکہ اپنی تجویز کردہ ابتداء کے مطابق ایک جدید مصحف بھی رمضان ۱۴۳۷ھ میں شائع کیا۔

چونکہ راقم الحروف کو ایک مدت سے نظم قرآن سے متعلق بعض فنون یعنی رسم المصحف وغیرہ سے ایک تعلق ہے اور کتب فن کی ورق گردانی اور مصاحف قدیمہ کی زیارت وملاحظہ کی سعادت حاصل رہی ہے اس لئے داعیہ پیدا ہوا کہ سابق مضمون کا تحقیقی جواب لکھا جائے چنانچہ تجزیۂ قرآن سے متعلق کتب فن کے مطالعہ اور قدیم مصاحف کے مشاہدہ کے بعد ایک تحقیقی مقالہ **''اجزاء واحزاب قرآن''** کے نام سپرد قلم کیا گیا اس میں احادیث و آثار اور صحابہ وتابعین کے تعامل اور اتباع تابعین کے نقول سے نظم قرآن کی متعدد تقسیمات اور اس کے اسباب ودلائل بیان کئے گئے غرض کہ پاروں کا ثبوت اور اس کی ابتداء وانتہاء خیر القرون سے ماثور ومنقول ہے۔ البتہ الجزاء الرابع عشر (چودہواں پارہ) کی ابتداء ''ربما'' سے متعدد دلائل کی قوت اور شواہد کی روشنی میں راقم الحروف پوری بصیرت سے عرض کرتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے پس صاحب مضمون ''ترتیب وتدوین قرآنی'' کا نقد صرف ایک چودہویں پارہ کے سلسلہ میں تو بجا اور صحیح تھا باقی سب منقول کے خلاف تھا، یہاں مذکورہ بالا مقالہ **''اجزاء واحزاب قرآن''** کا آخری حصہ تفصیلاً اور پاروں کے ثبوت پر اجمالی کلام قارئین کی خدمت میں پیش ہے

* استاذ حدیث وفقہ مدرسہ مفتاح العلوم، سورت، گجرات

سی پارہ کی تقسیم صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے (جو کہ ہر رات ایک قرآن کریم ختم کرتے تھے) حضور ﷺ نے فرمایا: اقرا القرأن فی شہر ......الخ۔ ایک ماہ میں قرآن پڑھو (مسلم شریف) امام نوویؒ لکھتے ہیں: صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت ایک ماہ میں قرآن ختم کرتی تھی (الاذکار) مسند الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں اس ارشاد نبوی ﷺ کی پہلی ہدایت ''مہینہ میں ایک ختم کرو'' پر عمل کرنے کے لئے (قرآن پاک کو جب تیس دنوں میں تقسیم کریں گے تو) ہر رات ایک سی پارہ یعنی تیسواں حصہ کی مقدار قرأت ہوا کرے گی۔ (فتح العزیز ۱/۲۹) حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی مذکورہ حدیث متعدد کتب احادیث میں موجود ہے۔

پاروں کی تقسیم اصل ہے

نظم قرآن کی جتنی تقسیمات کی گئی ہیں ان میں اجزائے ثلاثین کی تقسیم اصل ہے، علامہ سخاویؒ نقل کرتے ہیں: قال ابن المنادی ابو الحسین احمد بن جعفر المتوفی ۳۳۶ھ وکان الاصل ورد الثلاثین یعنی ابن المنادی فرماتے ہیں کہ ثلاثین کا ورد (یعنی یومیہ ایک مقدار تلاوت کا وظیفہ) اصل ہے (جمال القراء) ثم کان لعلماء الامۃ عنایۃ بہذا الموضوع فعمدوا مجتہدین الی تقسیم القرآن تقسیمات متعددۃ و یظہر ان ختم القرآن فی شہر کان مقصداً اساساً فی ہذہ التقسیمات لان الغالب علیہا تقسیمہ ثلثین جزءاً۔ پھر علمائے امت (تابعین واتباع تابعین) نے اس موضوع پر خاص توجہ مبذول فرمائی اور انہوں نے نظم قرآن کی متعدد تقسیمات اور اسکے حصص مقرر فرمائے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہینہ میں ختم قرآن ایک بنیادی مقصد ہے اسلئے کہ اجزائے ثلثین کی تقسیم غالب ہے۔ (المحرر فی علوم القران)

پاروں کی ابتداء وانتہاء

حضرات صحابہؓ کی ایک جماعت نے تلاوت کے لئے قرآن پاک کو تیس حصوں میں تقسیم کر کے روزانہ ایک مقدار کی تلاوت کا معمول بنایا تھا تو حضرات تابعین نے صحابہ کرامؓ کے عمل کو مدنظر رکھ کر ان مقادیر کی تعیین فرمائی، پس سی پاروں کی ابتداء وانتہاء قرن اول میں معہود ومعروف ہو چکی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے قدیم کتاب ''اجزاءِ ثلاثین'' میں ابوبکر بن عیاش تبع تابعی کے واسطہ سے سی پاروں کو نقل کیا گیا ہے اس کے بعد اہل علم وفن امام دانی، علامہ سخاوی، ابن جوزی وغیرہم نے اجزائے ثلاثین کو اپنی تالیفات میں اجمالاً وتفصیلاً ذکر کیا ہے، اس طرح تمام پاروں کی ابتداء وانتہاء متفق علیہ اور متوارث ہے اور بعض پاروں کی ابتداء میں سلف کا قلیل اختلاف تھا چنانچہ مصاحف ہندیہ کا سعودی مصاحف سے اختلاف بعض ہی پاروں میں ہے مگر وہ بھی نقل

کے مطابق ہے۔(ملاحظہ ہو"اجزاء واحزاب قرآن")

ہر مقدار کا عام نام "جزء" ہے

اور پھر سلف ہی نے خیر القرون میں ان مقادیر ثلاثین کی ہر مقدار پر جزء (پارہ) کا نام استعمال کیا، جزء کا نام اس مقدار کے لئے ایسا مختص ہوگیا کہ جب کوئی کہے کہ میں نے ایک جزء پڑھا ہے تو یہی اجزائے ثلثین میں سے ایک حصے کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے گویا مقادیر ثلثین میں سے ہر مقدار جزء کے نام سے موسوم ہوگیا۔
فمنهم من قسم القرآن ثلثين قسما و اطلقوا على كل قسم منها اسم الجزء بحيث لا يخطر بالبال عند الاطلاق غيره حتى اذا قال قائل: قرأت جزءاً من القرآن تبادر الى الذهن انه قرأ جزءاً من الثلثين جزءاً التى قسموا المصحف اليها (مناهل العرفان، المحرر فى علوم القرآن)۔یہی وہ نام ہے جو آج تک متقدمین ومتأخرین اصحاب فن کی کتابوں میں منقول ہے اور عدد رتبی یعنی الاول و الثانی الخ کے ذریعہ فرق کیا جاتا ہے اور آج تک عرب و ہند کے مصاحف میں "الجزء" عدد رتبی کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔ باقی ہر جزء کا مخصوص نام جو برصغیر میں رائج ہے سلف اور خلف سے بلکہ متأخرین اہل فن سے بھی ثابت نہیں ہے حتی کہ بارہویں صدی کے ختم تک مصاحف میں بھی منقول نہیں ہے۔

پاروں کے نام بالکل حادث ہیں

اس سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ تیس پاروں کے جو نام برصغیر کے مصاحف میں لکھے ہوئے اور مشہور ہیں وہ بالکل ہی حادث ہیں درحقیقت وہ پاروں کے نام ہی نہیں ہیں بلکہ ہر جزء کے محل ابتداء کو پہچاننے کے لئے جزء کے اول کلمہ کو مختص کیا گیا، لہذا اس کی حیثیت علامت جزء کی ہے جو بطور نام زبان زد ہوگیا۔ چونکہ ماضی قریب کے مسلمانان ہند نے ہر جزء کو اس کے حادث نام سے جانا اور پہچانا ہے اور یہ کسی نقل کے خلاف نہیں ہے تو اسے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ چودہویں پارے کی ابتداء "ربما" سے قطعاً نقل کے خلاف ہے پس اس کی علامت یا اس کا نام بھی من اغلاط العوام ہے اس لئے اس کی اصلاح ضروری تھی جو اللہ تعالی کی توفیق سے کی گئی ہے۔

چودہویں پارہ کی ابتداء سورہ حجر کے اول کلمہ "الر" سے ہے

سورہ کو سورہ سے ملا کر لکھنے کا دستور

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے نقلِ مصاحف کے بعد سے ہمیشہ یہ اہتمام کیا جاتا رہا ہے کہ مصحف کی کتابت میں سورتوں کا تسلسل اس طرح ہوتا کہ جہاں کوئی سورہ ختم ہوئی وہیں سے بغیر فصل کے دوسری اگلی سورہ

کی کتابت کی جاتی تھی چنانچہ ختم سورہ اور ابتدائے سورہ کا یہ جوڑ صفحہ کے شروع یا وسط یا اخیر میں دائیں یا بائیں ہر مصحف شریف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ جوڑ کبھی ختم جزء اور ابتدائے جزء کا سنگم ہوتا تھا اس اعتبار سے سورۂ ابراہیم جہاں مکمل ہوئی متصلا سورۂ حجر شروع کر دی گئی۔ اور راقم الحروف نے کثرت سے مصاحف قدیمہ مخطوطہ میں مشاہدہ کیا ہے کہ سورۂ ابراہیم و سورۂ حجر کا جوڑ صفحہ کے شروع، درمیان اور اخیر حصّے میں ہر طرح موجود ہے۔

حافظی مصحف کے ہر صفحہ کو آیت پر ختم کرنے کا دستور

پھر کتابت مصحف کے مذکورہ دستور کے ساتھ شاید بارہویں صدی میں حفظ و قرأت میں مزید تسہیل کی غرض سے مصحف کی کتابت میں ایک نئی امتیازی شکل اختیار کی گئی کہ ہر جزء کو چند اوراق میں اس طرح مکمل کیا جائے کہ ہر صفحہ بھی آیت پر ختم ہوتا کہ ختم صفحہ کے ساتھ آیت کے ختم سے ذہن کو سکون و یکسوئی نصیب ہو اور جس طرح ختمِ سورۃ سے قلبی مسرت ہوتی ہے پارہ کے ختم پر بھی فرحت حاصل ہو اور حفظ میں سہولت رغبت اور سرعت پیدا ہو۔ یہ مصحف حافظوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا اور بالنظر تلاوت کرنے والوں کے لئے بھی راحت کا سبب بنا خصوصاً تراویح کی ۲۰ / رکعت میں صفحہ کے اعتبار سے پارہ کا ختم کرنا اور پورے ماہ میں قرآن کا بآسانی ختم ہو جانا کشش کا ذریعہ بنا اور یہ مصحف (حافظی) سے مشہور ہو گیا۔ اس مصحف کی قبولیت پورے عالم میں ہوئی اور یہ بھی کتابت مصحف کا ایک دستور سا بن گیا، چنانچہ عرب ممالک کے بھی مصاحف اسی طرز کے ہوتے ہیں یعنی جزء کو چند اوراق میں ختم کرنے کے ساتھ ہر صفحہ بھی آیت پر ختم ہوتا ہے۔

سورہ حجر کی پہلی آیت کو دائیں صفحہ کے اخیر میں لکھنے کی وجہ

برصغیر میں حافظی قرآن پاک کی اس نئی کتابت میں اتفاق سے سورۂ ابراہیم کے ختم پر صفحہ کے ختم میں دو تین سطروں کی جگہ رہ گئی اس لئے بسم اللہ سمیت سورۂ حجر کی پہلی آیت کی بھی کتابت کی گئی تا کہ سورہ کا بلا فصل تسلسل بھی قائم رہے اور صفحہ بھی آیت پر ختم ہو جیسا کہ پورے مصحف میں اس کا اہتمام کیا گیا تھا۔

پاروں کے نام مسلمانان ہند کا تحفہ ہے

پھر کچھ زمانہ کے بعد لوگ ہر جزء کو شروع صفحہ کے ابتدائی کلمہ سے یاد رکھنے لگے اور پاروں کی ابتداء کو اس کلمہ سے پہچاننے لگے یہاں تک کہ وہ کلمہ اس پارہ کا نام سمجھا جانے لگا پس اجزاء کے ابتدائی کلمے جو نام تصور کر لئے گئے یہ بالکل ہی حادث ہیں اور مسلمانان ہند کی عنایت ہے فن قرأت کی قدیم کتابوں میں کہیں انکا ذکر نہیں ہے حتی کے ماضی قریب کی عربی تصنیفات میں بھی فقط الجزء کے ساتھ رقم لگا دیتے ہیں۔

پاروں کی پہلی سطر کو نمایاں کرنے کا معمول

پھر کچھ زمانہ کے بعد ہر جزء کی ابتداء کو مزید نمایاں کرنے کے لئے صفحہ کی پہلی سطر کا کبھی رنگ بدل دیا جاتا اور کبھی اس کا خط بڑا کر دیا جاتا تھا مگر چودھویں پارہ کی ابتداء جو سورہ حجر کی پہلی آیت سے ہے وہ شروع صفحہ میں نہ آنے کی وجہ سے ''نشان زدہ'' نہ ہوسکی اس کے بجائے ربما والی آیت پہلی سطر میں ہونے کی وجہ سے نمایاں ہوگئی۔ پاروں کے ابتدائی کلمے بطور نام برصغیر میں کچھ ایسے مشہور ہیں کہ حافظ یا ناظرہ خواں سے کسی پارہ کا نمبر بول کر سوال کیا جائے تو فوراً پہلی سطر کا پہلا کلمہ پڑھکر بتائیں گے۔

ربما سے ابتداء کی شہرت محض عامی ہے

اسی طرح چودھواں پارہ کا نام پوچھئے تو جواب دے گا'' ربما یود الذین کفروا '' نیز جب کسی حافظ یا ناظرہ خواں سے کہا جائے کہ چودواں پارہ پڑھو تو'' ربما یود الذین کفروا '' سے شروع کرتا ہے یعنی سورہ کی ایک آیت محض اس وجہ سے کہ ۱۴/واں کی علامت [الر] پر ہونے کے بجائے [ربما] پر ہے پہلی آیت قصداً نہیں پڑھی جارہی ہے خصوصاً جبکہ ہر پارہ الگ الگ طبع کیا گیا ہو جیسا کہ مساجد میں رہتا ہے اور نہ اسے چودھویں کا جز سمجھا جارہا ہے حالاں کہ یہ ایک امر ثابت بالدلائل سے اعراض ہے۔

الجزء ۱۳ کی انتہاء سورہ ابراہیم کی آخری آیت پر ہے

بہرحال الجزء الرابع عشر (۱۴/واں پارہ) کی ابتداء سورہ حجر کی پہلی آیت سے ہونا یقینی امر ہے کیونکہ نظم قرآن پاک کی جتنی تقسیمات ہیں بعض منصوص ہیں اور بعض ماثور ہیں اور یہ سب احادیث میں مذکورہ ہیں وہ سب خیر القرون میں ہوئی ہیں اور ائمۂ فن نے ان سب کا احاطہ کیا ہے چنانچہ ابن جوزی کی ''فنون الافنان'' اور امام شاطبی کے تلمیذ خاص علامہ سخاوی کی ''تجزیۂ القرآن'' میں تفصیلات موجود ہیں قرآن کی تنصیف یعنی دو حصہ سے لے کر ۳۶۰/حصوں تک کی پچاس سے زائد تک تقسیمات اور اسکے حصص کے مبدأ و منتہاء کو تفصیل سے بیان کیا ہے ان میں سے صرف تین تقسیم (۱) اجزائے ثلثین (۲) احزاب ستین اور (۳) ورد ۳۶۰/ ہر ایک میں سے ایک جزء یعنی ۱۵۶/واں ورد، ۲۶/واں حزب اور ۱۳/واں جزء کا خاتمہ سورہ ابراہیم کی آخری آیت کا آخری کلمہ (اولواالالباب) پر بالاتفاق ہوتا ہے۔ (مطالعہ فرمایئے ''اجزاء واحزاب قرآن'')

کلمہ ''ربما'' سے کسی بھی تقسیم کی ابتداء منقول نہیں ہے

اور سورہ حجر کی اول آیت سے اس کے بعد والے جزء ۱۴/، حزب/۲۷، اور ورد/۱۵۷ بالاتفاق شروع ہوتا ہے بقیہ تقسیمات کے اقسام میں سے کسی بھی جزء کا خاتمہ سورہ حجر کی اول آیت پر اور اس کے بعد کے جزء کی

ابتداء(ربما یود) سے بالاتفاق نہیں ہے حتی کہ متقدمین اور متأخرین قراء میں سے کسی کا کوئی قول بھی نہیں ہے۔ علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں: الحزب السادس و العشرون آخر ابراھیم باتفاق (۱/۱۴۵)۔ صاحبِ نثر المرجان لکھتے ہیں: الجزء الرابع عشر مبدؤہ بھذہ السورۃ ھکذا فی مصحف الجزری وفی مصحف آخر صحیح۔ علامہ نوری صفاقسی غیث النفع میں لکھتے ہے :منتھی الحزب السادس والعشرین اجماعا، اجزاء ثلاثین کی تفصیل میں ابن القیم جوزیؒ لکھتے ہیں: الجزء الثالث عشر خاتمۃ سورۃ ابراھیم (فنون:۲۷۰) مجمع البیان لعلوم القرآن مخطوطہ ۱۱۱۱ھ میں الجزء الرابع عشر سورہ حجر کی اول آیت پر لکھا ہے۔

”الر“ پہلی آیت کو تیرہویں کا جزء سمجھنے کی وجہ

اس لئے پورے یقین کے ساتھ عرض ہے کہ سورہ حجر کی پہلی آیت کا مصحف کے دائیں صفحہ کی آخری سطر میں لکھا جانا حافظی مصحف کے کاتب اول کے پیش نظر سورہ کو ملانے کے ساتھ صفحہ کو آیت پر ختم کرنے کی وجہ سے مطلوب تھا نہ کہ جزء ۱۳/ کو پورا کرنے کی غرض سے اور جب بسم اللہ سمیت سورہ حجر کی پہلی آیت داہنی طرف صفحہ کے اخیر میں لکھی گئی اور حافظی مصحف کے ہر جزء کو دس اوراق، بیس صفحات میں پورا کرنے کا معمول بنایا گیا جس میں پارہ کی ابتداء شروع صفحہ کی پہلی آیت سے اور پارہ کی انتہاء آخری صفحہ کی انتہاء پر آخری آیت سے ہے تو رفتہ رفتہ زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ذہن نے یہ تسلیم کرلیا بلکہ کسی درجہ میں نظریہ بن گیا کہ یہ آیت تیرہویں جزء کا آخری حصہ ہے جب ہی تو جزء کے آخری صفحہ کی آخری سطر میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ تصور یا نظریہ قطعاً صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حقائق سے عدم واقفیت اور دلائل سے بے خبر ہونے کی وجہ سے قائم ہوا ہے۔

۱۴/ ویں پارہ کی علامت یا نام ”الر“ ہونا چاہئے

اور جب تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ ۱۴/ واں جزء کی ابتداء سورہ حجر کی پہلی آیت سے ہے تو حافظی مصحف کی کتابت کا جو دستور اختیار کیا گیا تھا کہ جزء کی ابتداء صفحہ کی ابتداء سے ہو تو حجر کی اول آیت کا شروع صفحہ میں لانا طے ہوگیا اور تیرہویں جزء کے آخری صفحہ کی کتابت اس طرح ہو کہ سورہ ابراہیم کی آخری آیت کا آخری کلمہ ”اولوا الالباب“ صفحہ کی آخری سطر میں ہو چنانچہ جدید حافظی مصحف ”محمود المصاحف“ میں جو مصاحف میں ان شاء اللہ صحیح ترین نسخہ ثابت ہوگا ان دو صفحوں کی کتابت اسی نہج سے کی گئی ہے تا کہ قدیم مصاحف سے موافقت اور دلائل سے مطابقت قائم ہو جائے اور یہی جمہور علمائے فن کے نزدیک ثابت شدہ ہے نیز عرب ممالک کے مصاحف میں اسی طرز سے ہے۔ اوراب اس اعتبار سے پارہ کی علامت یا عرف عام کے اعتبار سے

اسکا نام ''الر'' بالکل احسن وانسب ہے جس طرح جزء اول کا نام ''الم'' بولا جاتا ہے جیسا کہ صاحب فن حضرت مولانا قاری ومقری اسماعیل صاحب گورینی مدظلہ تلمیذ حضرت مولانا قاری محب الدین صاحب الہ آبادیؒ نے راقم کے نام خط میں لکھا............ ''ہمارے ایک مخلص دوست جید عالم آئے تھے ان کو الجزء الرابع عشر دکھلایا تو انہوں نے فرمایا کہ اب اس کا نام بجائے رُبما کے ''الر'' ہونا چاہئے مجھے بھی یہ نام بہت اچھا لگا''۔

(تنبیہ) اس اصلاح کی ضرورت بہت پہلے سے تھی مگر کل شیئی مرھون بوقتہ اس لئے اب یہ اصلاح حافظی مصحف کی کتابت کے اعتبار سے موزوں اور ابتدائے جزء کے لحاظ سے بالکل موافق ہے اور دیگر اصحاب فن مدظلہم نے بھی اس اصلاح کو مستحسن سمجھا اور پسندیدہ نظر سے دیکھا ہے جو جمہور علمائے فن کے نزدیک ثابت ہے۔

☆ جاننا چاہئے کہ شریعت کے جن امور پر خیر القرون، سلف وخلف، متقدمین ومتأخرین علمائے امت میں توارثاً قائم ہوا اور امت کے نزدیک وہ امر معروف ومعہود ہو وہ سب قابل عمل اور لائق اتباع ہے لیکن جو چیز توارث کے خلاف جاری ہوجائے اور وہ بھی صدیوں کے بشرطیکہ اس کی پشت پناہی دلائل سے نہ ہو تو ایسی چیز قابل اصلاح ہوا کرتی ہے خصوصاً جبکہ وہ معہود ومنقول کے خلاف نظریہ بن جائے۔

اس لئے چودھویں پارہ کی ابتداء سورہ حجر کی پہلی آیت [الر] سے یہ توارث کے خلاف اقدام ہرگز نہیں ہے بلکہ خیر القرون سے ثابت شدہ امر کے خلاف نظریہ کی اصلاح ہے۔

لہذا اس اصلاح کو بسر وچشم قبول کرنا چاہئے اور آئندہ مصاحف کی اشاعت میں اس اصلاح کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ پس **الحق احق ان یتبع۔ وما توفیقی الا باللہ۔ فالحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ۔**

دعوتِ فکر وعمل

ایمان کی حفاظت ـــــــ کیوں اور کیسے؟؟

از: مولانا محمد انصار اللہ قاسمی*

ایمان کی حفاظت کیوں کی جائے.....؟؟اس لئے کہ:

- ایمان ہمارے لئے سب سے بڑی نعمت اور قیمتی دولت ہے۔
- ایمان کی نعمت کا اس دنیا میں کوئی مول اور تول نہیں۔
- ایمان کی وجہ سے ہمیں اپنے پروردگار کی عبادت و بندگی کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔
- ایمان ہو تو ہم کو اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی نصیب ہوتی ہے۔
- ایمان کی وجہ سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعتِ کبریٰ کو پاسکتے ہیں۔
- ایمان کے رہنے پر ہی ہم آقاءِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفادار امتی اور سچے عاشق کہلا سکتے ہیں۔
- ایمان کی وجہ سے ہمیں صحیح ڈھنگ کی زندگی گذارنے کا سلیقہ آتا ہے۔
- ایمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب اور ہدایت یافتہ بندوں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔
- ایمان ہی دنیا میں ہماری تمام تر کامیابی وکامرانی کا ذریعہ ہے۔
- ایمان ہی آخرت میں ہماری نجات وبخشش کے فیصلہ کا معیار ہے۔
- ایمان ہونے پر ہی صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ کے نام لیواؤں میں ہم شامل ہوسکتے ہیں۔
- ایمان سے ہی ہماری شان اور پہچان ہے۔
- ایمان ہی ہمارے لئے قابل صد اعزاز و لائق صد افتخار ہے۔
- ایمان رہنے پر ہی ہم اسلام کے سچے وفادار، پیروکار اور علمبردار کہلا سکتے ہیں۔
- ایمان اگر نہ ہو تو جانوروں اور چوپایوں سے بھی زیادہ ہم گئے گذرے ہوں گے۔

ایمان کی حفاظت اس لئے بھی اہم اور ضروری ہے کہ.....آج ہمارے معاشرہ میں ایمان پر ڈاکہ ڈالنے

* آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت تلنگانہ وآندھرا

کے لئے:

● خود کو ''احمدیہ مسلم جماعت'' کہنے والا قادیانی فرقہ سرگرم ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے ''آخری نبی'' ہونے کا منکر ہے۔

● ''شکیل بن حنیف'' کو مسیح و مہدی ماننے والوں کا فتنہ سرگرم ہے، جو قیامت کے قریب حضرت مہدی کے ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا منکر ہے۔

● دیندار انجمن والوں کا فتنہ سرگرم ہے، جس کا بانی صدیق دیندار چند بسویشور نے مرزا غلام قادیانی کی طرح نبی ﷺ اور دیگر انبیاء کرام کی شان میں بدترین گستاخی کی ہے۔

● نام نہاد ''جماعت المسلمین'' کا فتنہ سرگرم ہے، جس کے پیروکار اپنے علاوہ تمام اہل سنت والجماعت کے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔

● حدیث کا انکار کرنے والے ''اہل قرآن'' کا فتنہ سرگرم ہے، یہ گمراہ لوگ احادیث رسولؐ کے بارے میں عام مسلمانوں کو کنفیوژ کرتے ہیں۔

ایمان کی حفاظت کیسے کی جائے؟؟

● متقی اور مخلص علماء کرام کی صحبت میں رہ کر دین کے بنیادی عقائد کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

● اسلام کے بنیادی عقائد و معلومات پر مشتمل مستند و معتبر کتابوں کے مطالعہ کا معمول بنائیں۔

● روزانہ اپنے گھروں میں کسی وقت بنیادی عقائد اور گمراہ فتنوں سے متعلق لکھی گئی کتاب کی تعلیم کریں۔

● اہل حق علماء کرام کے اجتماعات اور اللہ والے بزرگوں کی مجلسوں میں خود بھی پابندی سے شرکت کریں اور اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ لے جائیں۔

● آپ جس عالم دین سے وابستہ ہیں، ہفتہ میں ایک دن اسلام کے کسی ایک بنیادی عقیدہ سے متعلق ان کے ساتھ مذاکرہ کریں۔

● سوشیل میڈیا (واٹساپ، فیس بک، انٹرنیٹ) سے دینی عقائد و معلومات کو حاصل کرنے سے احتیاط کریں۔

● اجنبی اور غیر متعارف شخصیات/ افراد سے مذہبی موضوعات پر گفتگو نہ کریں۔

● گمراہ اور خارج اسلام فرقوں (قادیانی، شکیلی، دیندار انجمن وغیرہ) سے تعلق رکھنے والوں سے میل جول نہ رکھیں۔

● مذہبی عنوانات پر نام نہاد دانشور اور ملحد قسم کے لوگوں کے لکچرس کی ویڈیوز نہ دیکھیں۔

● علماء دین کی رہنمائی سے آزاد ہوکر ''سیلف اسٹڈی'' نہ کریں۔

● اسلام سے وابستگی اور ایمان پر ثابت قدمی کے لئے ہر نماز کے بعد خصوصی دعاؤں کا اہتمام رکھیں۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَہٗ ۔

اے اللہ! ہمیں حق کو حق بتا کر ہمیں اُس کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرما، باطل کو باطل کی شکل میں دکھا اور ہمیں اُس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔

ماہنامے کے ممبران متوجہ ہوں

ماہنامہ اشرف الجرائد کے ممبران کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ جن احباب کی مدتِ خریدی ختم ہوگئی ہو وہ نوٹ فرمالیں کہ ہمارے نمائندے یکم ڈسمبر تا ۱۴؍ڈسمبر ۲۰۱۸ء چند علاقوں میں آئے ہوئے ہیں ان کے پاس نیچے دیئے گئے فون نمبرات پر رابطہ کرکے اپنا سالانہ زرِتعاون جمع کر سکتے ہیں۔

نمبر شمار	نمائندہ حضرات	علاقہ	فون نمبرات
۱	محمد یوسف	بیدر	7899001665
۲	محمد الیاس	گلبرگہ	7795382884
۳	محمد شریف	لاتور	8698388273
۴	محمد انس	ناندیڑ	9175105914
۵	محمد مزمل	پربھنی	9923249219
۶	محمد رضوان	بیڑ	7842959200
۷	محمد عبدالجبار	بودھن	7036542177
۸	محمد الطاف	نظام آباد	7386225042
۹	محمد سعداللہ	کریم نگر	7330991009
۱۰	محمد صلاح الدین	ظہیرآباد	7036293830
۱۱	محمد مصباح الدین	نلگنڈہ	7093830682
۱۲	محمد جمیل الدین حمزہ	کھمم	9133959503
۱۳	محمد یحییٰ زید	ورنگل	9063998916

فکرونظر

صحابی کسے کہتے ہیں؟

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

صحابی کی تعریف

لغت کے اعتبار سے صحب اور مصاحبة کے معنیٰ ساتھی ہونا، دوستی کرنا، اور ایک ساتھ زندگی بسر کرنا ہے۔ صاحب اسم فاعل کا معنیٰ ہے ساتھی، ایک ساتھ زندگی بسر کرنے والا، اس کی جمع صحب اور اصحاب آتی ہے، شرعی اصطلاح میں جمہور محدثین اور علمائے اصول حدیث کے نزدیک ''صحابی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو حالت اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا ہو اور پھر اسلام ہی پر اس نے وفات پائی ہو اگر چہ یہ صحبت طویل نہ ہو اور خواہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث نہ سنی ہو۔

جمہور اصولیین کا موقف

امام احمد بن حنبل، امام بخاری، ابوزرعة، ابن عبدالبر، ابوعبداللہ حاکم، ابن الصلاح، نووی، عراقی، ابن کثیر، اور ابن حجر عسقلانی رحمھم اللہ اجمعین، اور جمہور محدثین شرف صحابیت کے اطلاق کے لئے محض زیارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کافی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ خطیب بغدادی اور ابنِ جماعہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے صحابی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے: كُلُّ مَنْ صَحِبَهُ سَنَةً اَوْ شَهْرًا اَوْ يَوْمًا اَوْ سَاعَةً اَوْ رَآهُ، فَهُوَ مِنْ اصْحَابِهِ، لَهُ مِنَ الصحبةِ عَلَى قَدْرِ مَا صَحِبَهُ.

ہر وہ شخص جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی ہو ایک سال یا ایک مہینہ یا ایک دن یا ایک گھڑی یا اُس نے (حالتِ ایمان میں) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہو وہ صحابی ہے۔ اسے اسی قدر شرفِ صحابیت حاصل ہے جس قدر اس نے صحبت اختیار کی، (الکفایۃ فی العلم: ۵۱/۱، المنہل الراوی: ۱۱۱/۱)

امام بخاری رحمہ اللہ صحابی کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

وَمَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ اَوْ رَآهُ مِنَ المسْلِمِين فهوَ مِنْ اَصْحَابِه. (بخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی ﷺ، 1335:3، دار ابن کثیر الیمامۃ، بیروت)

مسلمانوں میں سے جس نے بھی نبی اکرم ﷺ کی صحبت اختیار کی ہو یا فقط آپ ﷺ کو دیکھا ہو، وہ شخص آپ ﷺ کا صحابی ہے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے صحابی کی درج ذیل تعریف کی ہے جو بہت جامع ومانع اور اہل علم کے ہاں مقبول اور راجح ہے: وَهُوَ مَنْ لَقِيَ النبی ﷺ مُؤمِناً بِه، وَمَاتَ عَلَى الْإِسْلَامِ، وَلَوْ تخلَّلَتْ رِدةٌ فِي الْأَصَحّ. صحابی وہ ہے جس نے حالتِ ایمان میں نبی اکرم ﷺ سے ملاقات کی ہو اور وہ اسلام پر ہی فوت ہوا ہو اگر چہ درمیان میں مرتد ہو گیا تھا (مگر وفات سے پہلے مسلمان ہو گیا)۔

ابن حجرؒ مذکورہ تعریف کی وضاحت میں لکھتے ہیں: وَالمرَادُ بِاللِّقَاءِ: مَاهُوَ أَعمُّ مِنَ المجَالَسَةِ، وَالمماشَاةِ، وَ وَصُولِ اَحَدِهِما إِلَى الآخَرِ، وَإِنْ لم يُكالمهُ، وَيَدْخُلُ فِيهِ رُؤيةُ اَحَدِهِما الآخَرَ، سَوَاءٌ كَانَ ذَلِكَ بِنَفْسِه اوَ بِغَيرِهِ

لقاء سے مراد (ایسی ملاقات) ہے جو باہم بیٹھنے، چلنے پھرنے اور دونوں میں سے ایک کے دوسرے تک پہنچنے اگرچہ اس سے مکالمہ بھی نہ کیا ہو، یہ مجلس اس لحاظ سے عام ہے (جس میں صرف کسی مسلمان کا آپ ﷺ تک پہنچنا ہی کافی ہے) اور لقاء میں ایک دوسرے کو بنفسہ یا بغیرہ دیکھنا بھی داخل ہے۔

(نزہۃ النظر بشرح نخبۃ الفکر: 64، قاہرہ، مصر: مکتبۃ التراث الاسلامی)

ابن حجر عسقلانیؒ اپنی کتاب (الاصابۃ فی تمییز الصحابہ 1/ 9) میں صحابی کی تعریف یوں رقم فرماتے ہیں:

الصحابی من لقی النبی مومناً به ومات علی الاسلام، فیدخل فیمن لقیه من طالت مجالسته له او قصرت، ومن روىٰ عنه او لم یرو، ومن غزا معه او لم یغزو، أومن رآه ولم یجالسه، ومن لم یره لعارض کالعمیٰ۔

''صحابی وہ ہے جو نبی سے حالت ایمان میں ملاقات کرے اور اسلام پر اس کو موت آئے، پس (اس تعریف میں) وہ داخل ہو جاتا ہے جس نے پیغمبر سے روایت بیان کی ہو یا نہ کی ہو، نیز آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ میں شریک ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اور اگر کسی نے آپ کو ایک بار دیکھا ہو لیکن آپ کی ہم نشینی کا شرف حاصل نہ کر سکا یا اصلاً آپ کی زیارت سے محروم رہا ہو کسی مانع کی بنا پر مثلاً وہ شخص نابینا ہو، تو ایسا شخص بھی آپ کی صحابیت کے زمرے میں داخل ہوگا۔

امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں؛فاما الصحابة فھم کل من جالس النبی ﷺ ولو ساعة و سمع منه ولو کلمة منه فما فوقھا (الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم ۵/ ۶۸)

صحابی وہ ہے جو آپ ﷺ کی مجلس میں شریک ہوا گرچہ ایک لمحہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو اور آپ سے ایک ہی کلمہ کیوں نہ سنے۔

حافظ سخاویؒ نے بھی ابن حجرؒ کی تائید کی ہے (فتح المغیث للسخاوی ۳/ ۵۸) اور حافظ سیوطی نے بھی یہی لکھا ہے (تدریب الراوی ۲/ ۶۱۲)

الغرض جمہور کے مسلک تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے ”طوبی لمن رآنی و آمن بی و طوبی لمن رأی من رآنی ولمن رأی من لم یرنی و آمن بی (میزان الاعتدال ۷/ ۱۸۲)

خوشخبری ہے اس شخص کے لے جس نے مجھے دیکھا (خواہ ایک مرتبہ ہو یا زیادہ بغیر کسی قید کے) اور مجھ پر ایمان لایا، خوشخبری اس شخص کے لئے بھی جس نے مجھے دیکھنے والوں کو دیکھا (تابعین) اور اس شخص کے لئے بھی جس نے تابعین کو دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔

ابونصر القشیریؒ فرماتے ہیں: لفظ الصحابی من الصحبة، فکل من صحبه لحظة یطلق علیه اسم الصحابی لفظا۔

لفظ صحابی صحبة سے مشتق ہے اور ہر وہ شخص جو آپ کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی رہے اس پر صحابی کا اطلاق ہوتا ہے۔ (البحر المحیط: ۴، ۳۰۱)

بعض محدثین کی رائے

بعض علمائے اصول کے نزدیک کسی شخص پر صحابیت کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ اس نے کچھ عرصہ آپ ﷺ کی صحبت میں زندگی نہ گزاری ہو نیز امام ابوزرعہ رازیؒ اور ابوداؤدؒ کے کلام سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ شرف صحابیت کے لے محض رؤیت کافی نہیں بلکہ طویل صحبت بھی ضروری ہے، اسی وجہ سے وہ حضرات طارق ابن شہاب کے متعلق فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا لیکن یہ صحابی نہیں، اسی طرح عاصم بن احول سے روایت ہے کہ عبداللہ بن سرجس نے آپ ﷺ کو دیکھا لیکن یہ بھی صحابی نہیں۔

اسی طرح محمد بن سعد نے طبقات میں علی بن محمد سے اور انہوں نے شعبہ سے انہوں نے موسی سیلانی سے روایت کیا کہ میں حضرت انس بن مالکؓ کے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ آخری صحابی رسول ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ کچھ بدو (دیہاتی) رہ گئے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا لیکن وہ صحابی نہیں (طویل صحبت نہ ہونے کی

وجہ سے)ابن صلاح اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے، اور حضرت سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک صحابی نہیں کہلا سکتا جب تک کہ اسے ایک یا دو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت طیبہ کا شرف حاصل نہ ہوا ہو، اور جب تک کہ وہ ایک یا زیادہ غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب نہ رہا ہو۔

مذکورہ روایات کے جوابات

حافظ عراقیؒ نے اس روایت کا یہ جواب دیا ہے :انه اراد بیان صحبة خاصة لیست لتلک الاعراب و کذا اراد ابو زرعه و ابو داود نفی الصحبة الخاصة دون العامة (یہاں صحبت خاصۃ مراد ہے یعنی ان دیہاتیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت خاصہ حاصل نہیں، اسی طرح ابو ذرعہ اور ابو داود کے کلام کا بھی یہی مطلب ہے کہ انہوں نے ابن شہاب اور ابن سرجس سے صحبت خاصہ کی نفی کی (شرح الفیۃ العراقی ۷) ان سب کا بہتر جواب یہ ہے کہ یہ سب شاذ روایتیں ہیں جو درخور اعتناء نہیں۔

ابن صلاحؒ نے سعید ابن مسیبؒ کی روایت کا یہ جواب دیا ہے کہ اول تو یہ روایت ہی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس کی سند میں محمد ابن عمر الواقدی ہے جو روایتِ حدیث میں ضعیف ہے، امام بخاری نے واقدی کو ضعیف کہا اور امام ذھبی نے میزان الاعتدال میں واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع نقل کیا ہے (شرح الفیۃ العراقی ۷) اور اگر صحیح مان بھی لیا جائے تو یہ بعض اصولیین کا مذہب ہے جو اجماع کے مقابلہ میں حجت نہیں (شرح الفیۃ العراقی ۷)

اور البحر المحیط میں امام زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس قول کو صحیح مان لیا جائے، تو بہت سے ایسے افراد جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہجرت کے نویں سال یا اس کے بعد اپنی قوم کے ساتھ اسلام قبول کرنے آئے اور پھر لوٹ گئے، یہ بھی زمرہ صحابیت سے نکل جائیں گے جیسے جریر بن عبداللہؓ، وائل بن حجرؓ اور معاویہ بن الحکم السلمیؓ جن سے بہت سی روایتیں مروی ہیں، جب کہ ان کے صحابی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (البحر المحیط: ۴/ ۱۰۳)

الغرض مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ جسے بھی بحالت ایمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور اس کا خاتمہ بالایمان ہوا تو وہ صحابی کہلاتا ہے اور جس کو بھی خواب یا بیداری میں زیارت ہوئی ہے اس نے آپ کا جسمِ مثالی دیکھا ہے، جسمِ حقیقی نہیں وہ صحابی نہیں۔ صحابیت کا شرف صرف ان خوش نصیبوں کو ہی حاصل ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیاتِ مبارکہ میں آپ کی زیارت اور آپ سے ملاقات کی ہے۔

راہِ حق

گنگا سے زمزم تک

حضرت مولانا محمد فاروق صاحب مفتاحی کشٹا پوری رحمہ اللہ ریاست تلنگانہ کے مؤقر عالمِ دین، دارالعلوم حیدرآباد اور مدرسہ فیض القرآن کشٹاپور کے مایہ ناز مدرس اور منتظم تھے، اُن کا خاندانی پس منظر اور اس کی تفصیلات خود حضرت مولانا رحمہ اللہ نے املا کروادی تھی، مولانا عرفات اعجاز اعظمی صاحب نے اس کو مرتب اور مہذب کردیا ہے، بڑی دلچسپ روداد اور عبرت خیز داستان ہے، افادہ کے لئے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ از مرتب

میرا خاندان تقریبا پچاس سال قبل ایمان کی روشنی اور ہدایت کی دولت سے محروم تھا، پورے گھرانے پر کفروشرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اللہ کے فضل سے والد صاحب کی حق کی جستجو اور تڑپ بارآور ہوئی اور پورا گھرانا ایمان کی دولت سے سرفراز ہوا۔ ایمان قبول کرنے والوں میں والد، والدہ، بڑے بھائی، میں اور مجھ سے چھوٹے ایک بھائی اور بہن تھے۔

والد صاحب بہت ہی معمولی، غریب اور مزدور پیشہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب کا نام زمانۂ کفر میں 'لکشمیا' اور دادا کا نام 'سایٓنا' تھا۔ والد صاحب جب سنِ شعور کو پہنچے تو ان کو گھر میں والد اور والدہ کا طریقۂ عبادت یعنی پوجا پاٹ کھٹکنے لگا۔ ان کو یہ بات انتہائی غیر معقول نظر آئی کہ اپنے ہاتھوں بت تراش کر ان کو گھر میں ایک خاص مقام پر رکھ کر ان کے سامنے سجدہ کیا جائے، حاجت روائی کے عقیدے سے ہاتھ جوڑا جائے اور پھر ایک خاص مدت کے بعد اس کو گھر سے نکال کر پانی میں پھینک دیا جائے، پھر اس کی جگہ دوسرا بت بنا کر اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد اکثر والد صاحب کہا کرتے تھے کہ دادا اور دادی کا یہ عمل ہمیشہ میرے ذہن میں سوالیہ نشان بن کر چبھتا رہتا تھا کہ کیسے اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا بت...... جس کی بے حیثیتی کا یہ عالم ہے کہ جب جی

چاہا اپنے ہی ہاتھوں تلف کر دیا...... معبود، خدا یا اپنے سے بڑا ہو سکتا ہے؟' والد صاحب کے بقول ان کو یہ احساس پندرہ، سولہ سال کی عمر تک غیر معمولی طور پر پریشان کرتا رہا۔ وہ مسلسل اس کے متعلق غور و فکر کرتے رہے تا آنکہ راہِ ہدایت بالکل بے غبار ہو گئی۔

بہر حال یہ ابتدائی اور بنیادی باتیں تھی، جس کے بارے میں غور و فکر کی صلاحیت اور توفیق اللہ نے دی اور اس کے نتیجے میں راہِ ہدایت آسان ہوئی۔

میرے دادا نشے کی ایک چیز جس کو آندھرا پردیش میں کی زبان میں 'سیندھی' [تاڑی] کہتے ہیں، ایک بستی سے دوسری بستی پہنچایا کرتے تھے۔ سیندھی پہنچانے کے لیے ایک جانور جس کو 'کھلگا' کہتے ہیں، جس پر چمڑے کا ایک بڑا بندھن ہوتا ہے جس میں سیندھی رکھی جاتی ہے، دادا نے پال رکھا تھا۔ والد صاحب بھی دادا کے ہمراہ اس کام میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ جب دادا ضعیف ہو گئے اور مزدوری کی عمر سے تجاوز کر گئے تو والد صاحب نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تنہا سیندھی جنگل سے بستی میں پہنچانے لگے۔

والد صاحب جب جنگل سے سیندھی لے کر بستی کی طرف روانہ ہوتے تو راستے میں غور و فکر کرتے رہتے اور سوچتے رہتے کہ اس 'کھلگے' کو چلانے والا کون ہے؟ جس زمین پر میں چل رہا ہوں اور یہ جانور اتنا بوجھ لے کر چل رہا ہے، آخر یہ زمین کس کی ہے؟ جس آسمان کے سائے تلے میں چلا جا رہا ہوں، اس کو آخر کس نے بنایا؟ ہمیشہ والد صاحب اسی طرح کی باتیں سوچتے ہوئے جنگل سے بستی تک کا راستہ طے کرتے۔

کچھ عرصے بعد فکر میں بالیدگی پیدا ہوئی اور والد صاحب کو یہ احساس ستانے لگا کہ جس ذات نے مجھے اور اس جانور کو زندہ رکھا ہے، جو ذات بھوک لگنے پر کھانا دیتی ہے، پیاس لگنے پر پانی دیتی ہے، اس کے حقوق کیا ہیں؟ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ جب یہ احساس والد صاحب کے اندر جاگا تو ابتدا میں عبادت کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ چلتے پھرتے بس یہی سوچا کرتے تھے کہ میں اس ذات کی عبادت کرتا ہوں اور اس کی تپسیا کرتا ہوں جو مجھے اپنی پیدا کردہ زمین پر چلاتی ہے بھوک لگنے پر کھانا دیتی ہے اور پیاس لگنے پر پانی مہیا کرتی ہے۔ چوں کہ والد صاحب کو یہ علم نہیں تھا کہ ایسی قادر مطلق ذات کو 'اللہ' یا 'خدا' کہتے ہیں یا پھر اپنی مادری زبان میں اسی کو 'بھگوان' کہتے ہیں۔ والد صاحب کہتے تھے کہ اسی انداز سے میں اپنے پالن ہار، پیدا کرنے والے مالک کو یاد کرتا تھا اور اس کی عبادت کی ذمہ داری کا جو احساس میرے دل میں پیدا ہوا، اس کی تکمیل کی یہی صورت میرے ذہن میں آئی اور لمبے عرصے تک متواتر یہی عمل کرتا رہا۔

والد صاحب کے استاذ جو کشٹاپور سے قریب ہی ایک چھوٹے سے گاؤں بدلاپور کے رہنے والے تھے، اس

وقت کے بڑے گیانی تھے اور پنڈت کہلاتے تھے۔ والد صاحب ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ اثنائے تعلیم والد صاحب کے دل میں بار بار یہ بات بڑی شدت سے آتی تھی کہ یہ مجھے علم دے رہے ہیں، میرا بھی فریضہ بنتا ہے کہ میں ان کی یا ان کے گھر کی خدمت کروں۔ چنانچہ والد صاحب نے ان کی ذاتی اور گھریلو خدمات اپنے ذمہ لے لیں۔ ان کے گھر کا پانی بھرتے، چکی پیستے، ان کے کپڑے دھوتے، گھر کی صاف صفائی اور جھاڑ وجھٹکا بھی کرتے۔ ان خدمات کی وجہ سے والد صاحب نے ان کے دل میں جگہ بنالی۔ پنڈت جی والد صاحب سے بہت محبت کرنے لگے، حالاں کہ اور بھی ساتھی پڑھنے میں والد صاحب کے ساتھ تھے، مگر جو غیر معمولی محبت استاذ کو والد صاحب سے تھی وہ کسی اور سے نہیں تھی۔ انھوں نے والد صاحب کو جائیداد یعنی کاشت کی زمین کا ایک بڑا حصہ انتہائی معمولی رقم میں دیا اور کہا کہ 'یہ زمین تم اپنے پاس کھیتی باڑی کے لیے رکھو، میں اس کو تمھارے نام لکھ دیتا ہوں۔ زمین حاصل ہونے کے بعد والد صاحب نے جنگل سے بستی میں سیندھی پہنچانے کی مزدوری ترک کر دی اور کاشتکاری میں لگ گئے۔ اللہ نے اس زمین سے بہت برکتیں عطا فرمائیں، گھر کی معاشی حالت سنبھلنے لگی اور کچھ دنوں میں والد صاحب اس قابل ہو گئے کہ جس سیندھی کو لانے کی مزدوری کرتے تھے، اس کا چھوٹے پیمانے پر کاروبار شروع کر دیا۔

سیندھی کے کاروبار کی ابتدا ایک بڑے ساہوکار کے قرض سے ہوئی۔ اس ساہوکار کا نام 'شرنپاّ' تھا۔ ابراہیم پور کا رہنے والا تھا۔ اس سے والد صاحب نے ربط پیدا کیا، جب مراسم استوار ہوئے تو سیندھی کے کاروبار کے لیے اس سے قرض لیا، اس کے بعد سیندھی کے کنٹراک کے کام کا آغاز کیا۔ اس کام سے والد صاحب کی مالی حالت دن بدن پختہ ہوتی چلی گئی۔ پھر والد صاحب نے زمین وجائیداد خریدنی شروع کی جو کئی ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح اپنی اور اپنے گھرانے کی معاشی حالت کو مضبوط سے مضبوط تر بنالیا۔

جب معیشت کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر والد صاحب کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کیسے صحیح معبود تک رسائی حاصل کروں؟ اس معبودِ حقیقی کے حقوق کیسے ادا کروں؟ صحیح راستے کی تلاش میں مسلسل والد صاحب نے اپنے کو لگائے رکھا اور جستجو جاری رکھی۔ والد صاحب کے ایک بڑے گہرے مسلمان دوست جو اسی بستی کے رہنے والے تھے، جن کا نام 'خواجہ صاحب' تھا۔ خواجہ صاحب اس وقت کے بڑے یونانی طبیب سمجھے جاتے تھے۔ کشٹا پور اور اطراف کی بستیوں میں دور دور تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں تھا، جس کی وجہ سے دور دراز کی بستیوں کے لوگ بھی بیماریوں میں خواجہ صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ خواجہ صاحب خوش دلی کے ساتھ بوقتِ ضرورت غریبوں کا مفت علاج بھی کرتے تھے۔ والد صاحب کے خواجہ صاحب سے بڑے گہرے مراسم تھے، ہمیشہ کا

ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ والد صاحب کی تڑپ اور حقانیت کی تلاش کو دیکھ کر ایک دن خواجہ صاحب نے کہا کہ ’آپ اچھی بات اور اچھی چیز کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں ہمارے مذہب کو قبول کر لیتے؟ دینِ اسلام ہی صحیح اور سچا دین ہے۔‘ والد کا مزاج مسلمان اور اسلام کے سلسلہ میں بہت سخت تھا اور مذہبی تعصب تو گویا اپنے عروج پر تھا۔ خواجہ صاحب کی بات سن کر والد صاحب نے کہا کہ ’اگر آئندہ آپ نے اس طرح کی بات کی تو میری اور آپ کی برسوں کی دوستی لمحوں میں ختم ہوجائے گی۔‘ خواجہ صاحب نے پوچھا کہ ’کیوں بھائی ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟‘ جواب ملا کہ ’تم اسلام کو اختیار کرنے کے لیے کہہ رہے ہو، مجھے اپنے جیسا مسلمان ہونے کے لیے کہہ رہے ہو، تمھارے مذہب جیسا گندہ اور برا مذہب کوئی نہیں ہے۔ آئندہ اگر اس طرح کی بات کی تو میں تم سے اپنی دوستی ختم کرلوں گا، بلکہ اس سلسلہ میں ہوسکتا ہے کہ تم سے دشمنی بھی پیدا ہوجائے۔‘

خواجہ صاحب والد صاحب کے مزاج کی سختی کو خوب اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے صراحتاً اس موضوع پر بات کرنا ترک کردیا، لیکن گاہے بگاہے تذکرتاً یا اشارتاً دینِ حق کی قبولیت کی بات والد صاحب کے سامنے لایا کرتے تھے۔ اللہ نے خواجہ صاحب کو ذریعہ بنایا جن کی زبان سے کبھی کبھار دین اسلام کی حقانیت اور خوبیوں کا تذکرہ چل نکلتا تھا، جس سے والد صاحب متأثر ہوتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ والد صاحب کو یہ احساس ہونے لگا کہ ایسی زندگی اچھی نہیں، حق کو اگر تلاش کرنا ہے تو اس کے لیے گھر بار کو چھوڑ کر باہر نکلنا ہوگا۔

چنانچہ تلاشِ حق میں والد صاحب باہر نکلے اور پنجاب پہنچے۔ وہاں گرونانک کے مذہب کو اختیار کیا اور تقریباً پانچ چھ سال تک اس مذہب کے پیروکار رہے۔ گرونانک کے اقوال ونظریات اور ان کے مذہب کا پنجاب میں رہ کر مطالعہ کیا۔ ان کی بہت سی اچھی باتوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کیا، مگر دل مطمئن نہیں ہوا پنجاب اور گرونانک کا مذہب دونوں ترک کردیا اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کی طرف رجوع کیا۔ سال دو سال بدھسٹوں کے درمیان بھی وقت گزارا، لیکن وہاں بھی اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوا۔ بدھ مذہب چھوڑنے کے بعد عیسائیت کی طرف مائل ہوئے۔ اس وقت عیسائی مشنری دینِ مسیح کے شیوع میں بہت زیادہ سرگرمی سے کام کررہی تھی۔ والد صاحب نے ان کی سرگرمی کو دیکھ کر اپنی عنانِ توجہ عیسائیت کی طرف موڑ دی اور تین چار سال تک ’جیکب‘ نام رکھ کر ان کے درمیان رہے، مگر ان کے عقیدۂ تثلیث کو کسی طرح ہضم نہیں کرسکے اور وہ ذہن میں پھانس بن کر اٹکا رہا۔ والد صاحب مسلسل سوچتے رہے کہ جو ذات بیٹے کی محتاج ہو، جس کو بیوی کی ضرورت ہو، وہ کیوں کر خدا ہوسکتی ہے؟ وہ کیسے حاجت روائی کرسکتی ہے؟ اس احساس نے شدت اختیار کی تو عیسائیت کو بھی خیرآباد کہہ دیا اور مایوس ہوکر وطن چلے آئے۔

جب ہر طرف سے مایوسی ہاتھ لگی اور وطن واپس آ کر مستقل قیام کا ارادہ کرلیا تو خواجہ صاحب نے ایک دن اس پوری مدت کی روئیداد پوچھی کہ 'کہاں کہاں گئے؟ کس سے ملے؟ کیا پایا؟' والد صاحب نے بتلایا کہ 'فلاں جگہ گیا، فلاں سے ملا اور فلاں فلاں مذہب اختیار کیا، مگر کسی بھی مذہب سے دل مطمئن نہیں ہوا' اس پر خواجہ صاحب نے کہا کہ 'دیکھو! اسلام اچھا اور سچا دین ہے، اپنی ذہنی عصبیت پس پشت ڈال کر اس کی طرف توجہ کرو۔ ان شاء اللہ تمھیں ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل ہوگا۔

والد صاحب مسلسل کئی سالوں تک در در کی ٹھوکر کھا چکے تھے اور ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے آخری چارۂ کار کے طور پر خواجہ صاحب کی بات کی طرف توجہ دی اور کہا کہ کچھ دینِ اسلام کے بارے میں آپ مجھے بتلائیے، تاکہ شرحِ صدر کی صورت میں میں اسے قبول کروں؛ خواجہ صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ انھوں نے سرکار دوعالم ﷺ کی سیرت طیبہ پڑھ کر سنانی شروع کی۔ والد صاحب نے کاروباری ذمہ داریوں کی وجہ سے کافی حد تک اردو سیکھ لی تھی اور سمجھنے اور بولنے کی حد تک اردو پر قابو پا لیا تھا، خواجہ صاحب نے سیرت کی جو کتاب سنانی شروع کی تھی وہ اردو ہی میں تھی، والد صاحب کی آگاہی سیرت کے بارے میں جیسے جیسے بڑھنی شروع ہوئی، اللہ نے ان کے دل کی کائنات کو پلٹنا شروع کیا، سیرتِ طیبہ کی سماعت سے ان کے اندر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ جب سیرت کی کتاب ایک حد تک سن چکے تو ایک دن خواجہ صاحب سے کہا کہ 'بس کریئے! کتاب بند کیجیے! مجھے افسوس ہے کہ اسلام اتنا اچھا مذہب ہے اور مسلمان اتنے خراب اور گندے ہیں۔ اتنے گندے اور غلیظ ہیں کہ گائے کا گوشت کھاتے ہیں' والد صاحب کا تصور تھا کہ گوشت خوری ایک کریہہ فعل ہے اور جو بھی قوم گوشت خور ہے، وہ ان کی نگاہ میں ناپسندیدہ تھی۔

بہر حال سیرت طیبہ سن کر نبی کریم ﷺ کی محبت ان کے دل میں بیٹھ گئی اور اسلام کی طرف رجحان بڑھا خواجہ صاحب سے کہا کہ 'آپ کا مذہب بہت اچھا ہے، آپ کے راہنما بہت اچھے ہیں، ان کے اصول بہت اچھے ہیں، ان کی زندگی بڑی پاکیزہ ہے۔ مجھے یہ چیزیں بہت پسند آ رہی ہیں، مگر مسلمانوں کی زندگی دیکھیں تو اسلام قبول کرنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے اسلام چاہیے، سچا مذہب اور صحیح راستہ چاہیے۔ مجھے آپ کے راہنما کی ساری چیزیں بہت اچھی لگیں، میرے دل میں ان کی محبت بیٹھ گئی ہے، میں ان کے راستے کو اپناؤں گا اور اسلام قبول کروں گا۔ مجھے آپ یہ بتائیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کیا کیا کام کرنے پڑیں گے؟ خواجہ صاحب نے بتلایا کہ آپ کو پانچ وقت کی نماز پڑھنی ہوگی، سال میں ایک مرتبہ رمضان کے مہینے کا روزہ رکھنا ہوگا، اللہ نے آپ کو وسعت دی ہے، اگر یہی وسعت باقی رہی تو زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ یہ بنیادی اعمال ہیں جن کی انجام دہی اسلام لانے کے بعد آپ کے ذمہ لازم ہوگی۔

(جاری۔۔۔۔۔)

فقہ وفتاویٰ

وضو سے متعلق چند احکام

ادارہ

وضو سے بچا ہوا پانی پینا

سوال: ہم لوٹے سے وضو کرتے ہیں اور وضو کا پانی بچ جاتا ہے اس کو کھڑے ہوکر پینا سنت ہے اور اس سے گناہ جھڑتے ہیں لیکن نل اور ٹنکی سے وضو کرنے والے کیا کریں، وہ تو اس سنت سے محروم ہیں تو کیا شکل اختیار کریں جس سے سنت ادا ہو جائے؟

جواب: ٹنکی یا نل وغیرہ سے وضو کرنے کے بعد چلو میں پانی لے کر کھڑے ہوکر پی لیا کریں امید ہے کہ وہ فضیلت پانے والا شمار ہوگا۔(فتاویٰ قاسمیہ:۵/ ۶۲)

اعضاء وضو تین دفعہ کے بجائے چار دفعہ دھونا

سوال: اگر کوئی اعضائے وضو کو تین دفعہ کے بجائے چار یا پانچ دفعہ دھوئے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اعضائے وضو کو تین مرتبہ سے زیادہ سنت یا ثواب سمجھ کر دھونا مکروہ ہے اور اگر ایسا نہیں سمجھ رہا ہے بلکہ صرف اِزالۂ شک اور دل کے اطمینان کے خاطر ہے تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔(شامی زکریا:۱/ ۲۵۸)

سر کا مسح بھول کر یا جان بوجھ کر چھوڑنا

سوال: اگر کوئی سر کا مسح بھول کر یا جان بوجھ کر چھوڑے یہاں تک کہ پورا دن گذر گیا اب یاد آیا کہ مسح چھوٹ گیا ہے اور اب تک کوئی حدث بھی نہیں ہوا تو کیا اب وہ صرف چوتھائی سر کا مسح کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا از سرِ نو وضو کرنا ضروری ہے؟

جواب: اگر مجلس وضو باقی ہے تو صرف مسح کرنا کافی ہو جائے گا، اسی طرح اگر مجلس بدل گئی لیکن اب تک اعضائے وضو تر ہیں تو اب بھی مسح کر لینا ہی کافی ہے، اور اگر کافی دیر ہوگئی اور اعضائے وضو بھی سوکھ گئے تو از سرِ نو وضو مسنون ہے۔(ہندیہ زکریا:۱/ ۸ بحوالہ فتاویٰ قاسمیہ:۵/ ۴۲)

استنجاء کے لئے سر ڈھانک کر جانا

سوال: کچھ لوگ استنجاء کرنے جاتے ہیں تو ٹوپی پہن کر یا ٹوپی نہ ہو تو سر پر رومال یا کوئی کپڑا رکھ کر بیت الخلاء جاتے ہیں تو کیا ٹوپی اوڑھ کر استنجاء کرنا سنت ہے؟

جواب: فقہاء نے سر ڈھک کر استنجاء کے لئے بیت الخلاء میں داخل ہونے کو مستحب لکھا ہے۔

(البحر الرائق: ۱/۴۲۱، زکریا)

بوقتِ غسل وضو

سوال: غسل کرتے وقت جو وضو کیا جاتا ہے اس سے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: غسل کرتے وقت جو وضو کیا جاتا ہے اس سے نماز پڑھ سکتے ہیں، نماز کے لئے الگ سے وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔ (نسائی، باب ترک الوضو من بعد الغسل: ۱/۴۹)

پینٹ کی ہوئی دیوار سے تیمم

سوال: جس دیوار پر پینٹ کیا جاتا ہے، کیا اس دیوار سے تیمم کر سکتے ہیں۔؟

جواب: جس دیوار پر پینٹ کیا جاتا ہے، اس دیوار پر تیمم کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ پینٹ رنگ ہے مٹی کی جنس سے نہیں ہے البتہ اگر چونا ہے تو اس سے تیمم کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ: ۵/۱۶۷)

چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا

سوال: (۱) کیا چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟ (۲) اگر جائز ہے تو کب تک مسح کر سکتے ہیں؟ (۳) موزوں پر مسح کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ (۴) وضو کر کے نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ وضو کئے بغیر موزے پہننا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: (۱) چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا متواتر احادیث سے ثابت ہے، اس لئے بلا شبہ جائز ہے۔ (۲) مسح کرنے کی مدت مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات ہے اور مسافر کے لئے تین دن اور تین رات ہے۔ (۳) مسح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ کی تین انگلیوں کو تر کر کے پیروں کی انگلیوں کے سرے پر رکھ کر پنڈلیوں تک کھینچا جائے۔ (۴) نماز کے بعد اگر وضو نہ ٹوٹا ہو تو دوبارہ وضو کئے بغیر نماز کے وضو ہی پر موزے پہن لینا جائز ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ: ۵/۱۷۲)

خبر نامہ

عالم اسلام کی خبریں

✷ روہنگیا باشندوں کی حقوق تلفی کی مذمت؛ اقوامِ متحدہ کی قرارداد۔ (روزنامہ سیاست، ۱۸؍نومبر ۱۸ء)

✷ الجریا میں انسانی اسمگلروں کے چنگل سے ۹۳ بچے آزاد۔ (روزنامہ سیاست، ۲۰؍نومبر ۱۸ء)

✷ سعودی عرب میں برقعہ کے خلاف خواتین کا احتجاج۔ (ڈیلی ہنٹ نیوز پرٹل، ۱۹؍نومبر ۱۸ء)

✷ اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کی حمایت میں ۷؍قراردادوں کی منظوری (روزنامہ اعتماد، ۱۹؍نومبر ۱۸ء)

✷ آسٹریلیا اپنا سفارتخانہ القدس منتقل کرنے سے باز رہے؛ مہاتر محمد (روزنامہ اعتماد، ۱۷؍نومبر ۱۸ء)

✷ القدس میں ۲۰؍ہزار کمروں والی ہوٹل تیار کرنے اسرائیل کا اعلان۔ (روزنامہ اعتماد، ۱۷؍نومبر ۱۸ء)

✷ سعودی عرب نے غریب مما لک کا ۶ عرب ڈالر کا قرض معاف کردیا۔ (روزنامہ منصف، ۱؍نومبر ۱۸ء)

✷ متحدہ عرب امارت اور سعودی عرب کا یمن کے لئے ۵۰۰ ملین ڈالر اضافی امداد کا اعلان

(روزنامہ منصف، ۲۱؍نومبر ۱۸ء)

✷ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ نوجوانوں کے لئے مشعل راہ: اردگان (روزنامہ منصف، ۲۰؍نومبر ۱۸ء)

✷ شرائط پورے کرنے پر قطر سے بہتر تعلقات ممکن؛ سعودی ولیعہد (روزنامہ اعتماد، ۳۰؍نومبر ۱۸ء)

✷ روہنگیا پناہ گزیں مسلمانوں کی وطن واپسی کی مخالفت؛ بدھ راہبوں کا جلوس (روزنامہ سیاست، ۲۶؍نومبر ۱۸ء)

✷ افغان بچوں کی تعلیم وصحت کی صورت حال انتہائی تشویشناک؛ یونیسف (روزنامہ منصف، ۲۹؍نومبر ۱۸ء)

✷ حماس کی جدوجہد وطن کی آزادی کے لئے ہے؛ اسماعیل ھنیہ۔ (روزنامہ اعتماد، ۱؍ڈسمبر ۱۸ء)

✷ اسرائیل نے ترکی میں اپنا سفارتی درجہ کم کردیا۔ (روزنامہ اعتماد، ۱؍ڈسمبر ۱۸ء)

✷ افغانستان میں ۶۰؍لاکھ افراد انسانی امداد کے محتاج ہیں؛ یونیسف۔ (روزنامہ اعتماد، ۱؍ڈسمبر ۱۸ء)

✷ افغانستان کو ۴۰؍ہزار ٹن گیہوں کا تحفہ کی پاکستان معاشی کوآرڈینیشن کی منظوری۔

(روزنامہ اعتماد، ۱؍ڈسمبر ۱۸ء)